علّامہ اقبالؒ کا نظریۂ پاکستان

ڈاکٹر وحید عشرت

پی ایچ ڈی (فلسفہ)

علاّمہ اقبال کا نظریۂ پاکستان

(دو مقالات)

*

ڈاکٹر وحید عشرت

پی ایچ ڈی (فلسفہ)

*

پاکستان فلسفہ اکادمی

۱۶۶ - ستلج بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور فون: ۴۳۰۴۹۵

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر : پاکستان فلسفہ اکادمی ۔ لاہور
قیمت : ۵ روپے
تعداد : ۵۰۰
طبع اول : ۱۹۸۴ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دیباچہ

یہ پمفلٹ جو میرے دو مقالات پر مشتمل ہے، پاکستان فلسفہ کانگریس کے دو مختلف سالانہ سمپوزموں میں پڑھے گئے، جو پنجاب یونیورسٹی لاہور کے سینٹ ہال میں منعقد ہوئے ان مقالات میں واضح طور پر ان محرکات کی نشان دہی کی گئی ہے جو پاکستان کے قیام کا محرک بنے اور ان تصورات کو بھی بیان کیا گیا ہے جو جمہوریت اقتصادی مساوات، سماجی انصاف اور مسلمانوں کے اجتماعی تشخص اور خوشحالی کی صورت میں پاکستان کے اکابرین حکیم الامت حضرت علامہ محمد اقبالؒ اور حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کے پیش نظر تھے۔ ان مقالات میں وہ فکری اساس بھی فراہم کی گئی ہے جو پاکستان کا بنیادی محرک تھی اور جسے علامہ اقبال نے مفکر پاکستان کی حیثیت میں اپنے پیش نظر رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا قیام ان مقالات کی روشنی میں صدی رواں کے برصغیر کے مسائل و معاملات کا ایک لابدی اور فطری حل تھا اور جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کے مسئلے کا اور کوئی حل مفید نہ ہو سکتا تھا کہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو ان کی اکثریت کے علاقوں میں اپنی مرکزیت اور ریاست قائم کرنے کا موقع دیا جائے جہاں وہ اپنا مرضی اور منشا سے جیسی کہ وہ چاہیں حکومت قائم کریں آج اس فطری اور بنیادی حقیقت کے بارے میں مختلف گوشوں سے اٹھنے والے اعتراضات نہایت درجہ غیر منطقی ہیں اس لیے کہ وہ ایک تو اس صورت حال کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں جس میں کہ جنوبی ایشیا کے مسلمان پھنسے ہوئے تھے دوسرے قیام پاکستان کے بعد برسر اقتدار حکومتوں نے اسلامی نظریاتی جمہوریت، سماجی انصاف اور اقتصادی مساوات کے مقاصد عالیہ کو نظر انداز کر دیا جو کہ پاکستان کے

قیام کے وقت علامہ اقبال اور قائداعظم کے پیش نظر تھے بلکہ مفاد پرست عناصر نے تو جمہوریت کا گلا گھونٹنے کے لیے علامہ اقبال کے ان ارشادات کا سہارا لینا شروع کر دیا جو انہوں نے لادینی، مغربی اور بعد میں اشتراکی جمہوریت کے بارے میں کہے تھے اور جو ہندو اکثریت اور مسلم اقلیت کے برصغیر میں علامہ اقبال کے لیے کیا کسی بھی مسلمان کے لئے ناقابل قبول تھی حالانکہ اسلامی نظریۂ حیات پر مبنی نظریاتی اسلامی جمہوریت تو علامہ کا مقصود تھا جس میں اقتدار اعلیٰ خدا کی ملکیت ہوتا ہے اور اس کے بندے خدا کے خلیفۃ الارض ہونے کی حیثیت سے اس اقتدار اعلیٰ کو خدا کی مرضی و منشا کے تحت باہمی مشاورت اور کثرت رائے سے چلانے کے پابند ہیں کہ خود حضورؐ نے بھی فرمایا تھا کہ میری اُمّت کا سواد اعظم کبھی نہیں بھٹک سکتا۔ امت مسلمہ کا سواد اعظم باہمی مشاورت سے اسلامی ریاست کے معاملات انتخاب کے اصول پر اپنی منتخب حکومت کے ذریعے چلائے تو یہ وہی نظام ہے جو اسلام کو مطلوب ہے اور جسے علامہ اقبال اشتراکی اور مغربی دونوں جمہوریتوں پر فائق سمجھتے تھے اور اپنے نظریہ کے تحت جسے پاکستان میں اقتصادی جمہوریت سماجی انصاف اور اسلامی نظریۂ حیات کی پرداخت و برداشت کے لیے لازم تصور کرتے تھے۔ علامہ اقبال اور قائداعظم کے جس تصور پاکستان کا نقشہ آپ آگے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے وہ انہیں مقاصد عالیہ پر مشتمل ہے جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں اور جو پاکستان کو ایک فلسفیانہ اساس فراہم کرتے ہیں اور جس کی طرف لوٹنے کی دعوت اس پمفلٹ کی اشاعت کا بنیادی محرک بنی ہے تاکہ ہمیں منزل اور نشان منزل کا صحیح ادراک حاصل ہو سکے۔

ڈاکٹر وحید عشرت
پی ایچ ڈی (فلسفہ)
پی او بکس نمبر ۲۳۱۶ لاہور

علامہ اقبال کا نظریہ پاکستان

ایک تخلیقی شعور کے حامل نظریہ کی بنیادی خصوصیات میں سے نمایاں ترین ایک صفت یہ ہے کہ وہ عوام میں نہ صرف گہرے طور پر نفوذ حاصل کرتا ہے بلکہ اس سے بڑھ کر وہ سماج میں وسیع سطح پر تغیر و تبدل لانے کے لیے تخلیقی شعور اور قوتوں کی حامل قیادت بھی خود فراہم کرتا ہے۔ جو اس نظریہ کے جمال و جلال کی پیکر ہوتی ہے اور وہ قیادت پورے سماج میں اپنی بے پناہ صلاحیتوں اور قوتوں کے ساتھ ایک ایسی جماعت کی تشکیل و تدوین کرتی ہے جو اس نظریہ کی اساس پر ایک ہمہ گیر عمرانی انقلاب کو انگیخت کرتی ہے اور یوں وہ نظریہ کسی سماج میں رچ بس کر اس کی تشکیل نو کرتا ہے اور کسی سماج میں تخلیقی قوتوں کو مجتمع کر کے اس میں انقلابی روح اور کردار کو پھونکتا ہے یہی انقلاب انسانوں کو جبر و استحصال سے نجات دلا کر ان کے کردار کو نئے معنی پہناتا ہے جس سے ایک طرف تو فرد، فرد سے جڑتا ہے اور دوسری طرف فرد سماج کی تخلیقی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اور یوں اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر کے اپنے تخلیقی کردار کا اظہار کرتا ہے۔

پاکستان کی تحریک یا نظریہ پاکستان کا بنیادی مقصد ایک نظریہ کی ایک سرزمین سے پیوستگی ہے علامہ اقبال نے یورپ کی مادیت کا جب گہرے شعور کے ساتھ مطالعہ کیا تو انہوں نے دیکھا کہ یورپ کی تہذیب تنازع للبقا کے مادی تصور پر اپنی اٹھان رکھتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شے اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے جنگ لڑ رہی ہے اور اپنے وجود کو بچانے کے لیے دوسرے کو نگل رہی ہے ہر کہیں محاربہ ہے اور ہر ایک وجود دوسرے کا دشمن ہے سارتر کے ہاں "دوسرے آدمی

کا وجود جہنم ہے" - اسی تصور پر اپنی اساس رکھتا ہے۔ محاربہ، تنازعہ، کشمکش اور مخاصمت مادی تہذیب کا وہ اساسی اصول ہے جس پر یورپ کی مادی تہذیب کی اٹھان ہے ہیگل کا دعوئے Thesis نفی دعویٰ Anti Thesis اور مرکب دعویٰ Synthesis بھی اسی شعور پر اپنے تصور مطلق (Absolute Idea) کے ارتقاء کی اساس رکھتا ہے۔ فشٹے، کامت اور دیگر یورپی عمرانی مفکروں کے ہاں بھی "فرد سماج کا دشمن اور سماج کا فرد دشمن ہے" کا تصور اسی شعور پر اپنا ہیولے رکھتا ہے مارکس کے ہاں تاریخ کی جس مادی جدلیت کا شعور ملتا ہے اس کے پیچھے بھی کشمکش، محاربہ اور مخاصمت کے جذبات اسی تنازع للبقا کے تصور پر قائم ہیں۔ مارکس نے البتہ اتنا کیا کہ اس نے فرد کی فرد اور فرد کی سماج اور سماج کی فرد سے کشمکش کو طبقات کی کشمکش میں بدل دیا مگر اس کا اساسی تصور کہ کشمکش ہی حرکت کا سبب ہے کو نہ بدلا۔ اس کی وجہ اس کی یہ مجبوری تھی کہ اس مادیت پر اس نے اپنے نظریے کی اساس رکھی تھی جس پر خود سرمایہ دارانہ تہذیب قائم ہوئی تھی۔ چنانچہ سرمایہ داریت اور اشتراکیت دونوں کی اساس مادیت پر استوار ہے اور دونوں کے ہاں ترقی اور ارتقاء کا اصول کشمکش، محاربہ اور تنازع ہے اس سے یورپ میں جو فکری انارکی اور ذہنی انتشار پیدا ہوا اس نے یورپی مفکروں کے ذہن اور اعصاب کو تھکا دیا ہے ان کے رویہ کی جھنجھلاہٹ اب اس قدر بڑھ گئی ہے کہ وہ زندگی کو معانی سے تہی گردانے لگے ہیں۔ زندگی کی بے معنویت اور لغویت کے پسِ پردہ یورپ کی مادی تہذیب کے زیر سایہ جنم لینے والا مغربی ذہن ہے جو کشمکش اور محاربہ کے اعصاب شکن مراحل سے گزر کر اور دوسرے انسان کے وجود کو جہنم تصور کر کے معنیٰ حیات کی یافت کو لغویت تصور کر رہا ہے زندگی کی لغویت کے اس تصور نے نہ صرف مغربی تہذیب کو زوال کے پہلے مرحلے کی طرف بڑھا دیا ہے بلکہ یورپی تہذیب کے کھوکھلے پن کو بھی ننگا کر دیا ہے۔

مغربی تہذیب کی فکری اساس

علامہ اقبال کے ہاں مغربی تہذیب کے اس شعور کا واضح طور پر ابلاغ موجود ہے وہ شاخِ نازک پر بننے والے اس آشیانہ کی خودکشی کی حرکت سے آگاہ تھے یورپی تہذیب کی موجودہ چمک دمک

ان کے ہاں جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری کے سوا کچھ نہ تھی۔ علامہ اقبال کے نزدیک یورپی تہذیب کی موجودہ ترقیات اس تہذیب کے باقیات تھے جو اسلام نے انگیخت کی تھی۔ علامہ اقبال کے ہاں اس کا ابلاغ واضح طور پر پایا جاتا ہے۔ اشتراکیت کا ظہور خود اس کے فاسد بطن سے ہوا اس نے یورپی تہذیب کے ایک ستون کو گرا دیا تھا۔ اور وہ ستون تھا نسلی تفاخر کی بنیاد پر وطنیت پرستی ، اشتراکیت نے نہ صرف وطنیت کے تصور کو باطل کر دیا بلکہ اس کے ساتھ نسلی تفاخر کا قلع قمع بھی کر دیا۔ اور انسانوں کے مابین معاشری مساوات کا تصور مغربی یا یورپی تہذیب میں عملی طور پر پہلی بار پیش کیا اس کے علاوہ اشتراکیت نے معاشی محرکات کے سماجی تغیر میں اہم کردار کا شعور حاصل کیا اور اس شعور کی بنیاد پر اپنے ہاں ایک نظریہ کی تخلیق کی اور یوں اشتراکیت نے مغربی تہذیب کو پہلی مرتبہ ایک نظریاتی سماج کا شعور عطا کیا۔ مگر ان اشتراکیت کی اچھی اور قابل تعریف کامیابیوں کے باوصف اس میں بنیادی نقص اس کی مادیت پر تشکیل تھی اور اس کے ہاں بھی حیات کا ارتقاء، کشمکش اور محاربہ کا رہین منت تھا چنانچہ وہ بھی تھوڑی دور ساتھ چلنے والے راہرو کی طرح ٹھہری اور مغربی تہذیب اپنے سچے رہبر سے محروم رہی۔

علامہ اقبال نے مغربی تہذیب کی تعمیر میں مضمر خرابی کا جب واضح طور پر ادراک حاصل کیا تو ان پر بھی تشتت، بے چارگی، ذہنی کشمکش اور امید و بیم کا ایک عجیب دور آیا یہ وہی دور ہے جس کی طرف خود اقبال نے اپنے خطوط بنام عطیہ میں بار بار اشارہ کیا ہے۔ پروفیسر محمد عثمان[1] کے ہاں حیاتِ اقبال کا یہی دور وہ جذباتی دور ہے جب وہ سوچ و بچار میں گم رہتے وہ ایک تہذیب کو اپنی آنکھوں سے اگلے برسوں میں مرتا ہوا دیکھ رہے تھے اور ایک دوسری تہذیب کے کھنڈرات انہیں سسلی اور اسپین سے لے کر سمرقند و بخارا تک نظر آ رہے تھے ہر کہیں اس تہذیب کے حاملین غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے ان میں شکست خوردگی کا ایک گہرا احساس پایا جاتا تھا۔ ان کے ہاں روح جہاد و اجتہاد سرد پڑ چکی تھی اور ہر کہیں، جمود تھا ان کی تمام ترجمانی اور ذہنی قوتیں غیر تخلیقی سرگرمیوں میں الجھ کر خود اپنے ہی وجود کو مٹانے کا باعث بن رہی تھیں

---

[1] عثمان، محمد۔ حیاتِ اقبال کا جذباتی دور، موصوف کی کتاب کا نام۔

ان میں فرقہ پرستی، جھوٹے فتنے اور کاذب نبی پیدا ہو رہے تھے۔ خود وہ معمولی باتوں پر تکفیر کے فتوے جاری کر رہے تھے۔ بدعات عام تھیں بلکہ اسلام کی اصل تعلیمات پر بدعات کی ملمع کاری کی ہوئی تھی۔ بدعات کا اتنا زور تھا کہ مسلمان قرآن کے اصل حکم نماز کی پرواہ نہیں کرتے تھے جبکہ بدعات کو بڑے اہتمام کے ساتھ ادا کرتے تھے اور کرتے ہیں۔ تاویل و تفسیر کو غلط مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اہلِ علم کے لیے اجتہاد شجرِ ممنوعہ تھا۔ شکست خوردگی، انتشار اور انار کی کا ایک سیلاب اُمڈ رہا تھا۔ اس پر مستزاد پوری دنیا میں مسلمانوں کا وجود مٹانے کے لیے صلیبی جنگوں کے شکست خوردہ یورپی عیسائی ممالک اور اقوام کی سرگرمیاں تھیں جنہیں وہ اپنی تمام تر سیاست، علم و تدبر اور حکمت عملی سے بروئے کار لا رہے تھے۔ ہندو برصغیر میں مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ مل کر مٹانے کے درپے تھے۔ اشتراکیت نے سمرقند و بخارا اور تاشقند سے ہمیں ختم کر دیا تھا [1]۔ اسپین سے ہم رخصت ہو چکے تھے۔ رومانیہ اور بلغاریہ وغیرہ سے بھی ہمارا صفایا کر کے کم از کم یورپ سے ہمیں رخصت کر دیا گیا اور ایشیا میں بھی ہم پر تابڑ توڑ حملے جاری تھے یوں لگتا تھا کہ مغربی تہذیب خود تو مر رہی ہے۔ مگر وہ ساتھ ہی ہمارا بھی گلا گھونٹ کر رہے گی۔ برصغیر میں ہندو اور مشرقِ وسطےٰ میں عیسائی یہودی گٹھ جوڑ اس میں معاون ہو گیا تھا۔

علامہ اقبال کے سامنے دو سوال تھے ایک تو یہ کہ وہ اسپین کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے وجود کو مٹنے سے کیونکر بچا سکتے ہیں یہ ایک سیاسی اور تہذیبی سوال تھا اور دوسرا سوال ایک فکری سوال تھا یا فلسفیانہ مسئلہ، کہ کیا مادیت کے سوا کسی اور بنیاد پر انسانی سماج کی اٹھان رکھی جا سکتی ہے فرد اور کائنات، فرد اور سماج اور فرد اور فرد کے مابین تعلق کی جو تعبیر مادیت نے کی ہے کیا وہ قطعی ہے؟ اور اگر وہ قطعی ہے تو انسانوں کا مقدر کیا ہے؟ یہی بے معنویتِ حیات کی لغویت اور انسانوں کی بربادی اور تباہی یا مادیت سے ہٹ کر بھی کسی اور اصول پر کائنات اور انسان، فرد اور سماج اور فرد اور خدا کے مابین تعلق کی تعبیر و تاویل کی جا سکتی ہے اور اس کی اساس پر بھی کوئی فلسفہ تشکیل دیا جا سکتا ہے۔

[1] آباد شاہ پوری کی کتاب مسلم روس اور ہمالیوں ادیب کی کتاب نیا سامراج دیکھیے۔

اسلامی تہذیب کی نظریاتی اساس

قرآن حکیم کے گہرے شعور، اسلامی علوم پر وسیع عبور اور یورپی فلسفہ وحکمت کے بسیط مطالعہ کی بنا پر علامہ اقبال نے اس نظریہ کا ابلاغ حاصل کیا کہ اسلام مغربی تہذیب کے بالمقابل جس تہذیب کا علمبردار ہے اس کی اساس مادیت پر ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس وہ روحانیت پر اپنی اٹھان رکھتا ہے اسلام کے فلسفۂ ارتقاء میں زندگی کی اٹھان کشمکش، محاربہ، مخاصمت، نفرت اور تنازع پر نہیں۔ بلکہ اسلام میں انسانی زندگی کا ارتقاء محبت پر موقوف ہے اسلام میں فرد فرد کا دشمن نہیں بلکہ ایک فرد دوسرے فرد کا رفیق و مونس وغم خوار اور شریک دکھ درد ہے۔ فرد سماج کا دشمن ہے اور نہ سماج فرد کا حریف، ایک فرد دوسرے فرد کے لیے ایک ایسی ہستی ہے جو اس کی شخصیت کی تکمیل کے لیے اور اس کی عمرانی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے لابدی ہے اگر ایک ہی فرد دنیا میں ہوتا یا افراد ایک دوسرے سے لاتعلق ہوں یا ان میں ہر گھڑی کشمکش اور محاربہ کی کیفیت ہی ہوتی تو انسانی تہذیب کا یہ باکمال محل تعمیر نہ ہوتا جو انسان نے صدیوں کی محنت سے روئے ارض پر ایستادہ کیا ہے، انسان ہی انسان کے آنسو پونچھتا ہے۔ انسانی کردار کا مثبت پہلو محبت، تعاون، غم خواری، رفاقت اور شراکت سے عبارت ہے۔ انسانی تہذیب کی جلوہ آرائی میں انسانی سماج کی تعمیر و تشکیل میں خاندان کے قیام میں اور اسی طرح انسان کے وجود میں، تہذیب و تعلیم میں انسانوں کا ایک دوسرے کے لیے تکلیف اور دکھ سہنا محبت کے جذبہ کی ہی پیداوار ہے البتہ جب محبت غلو کے درجہ تک پہنچ جائے تو اس کا سلبی رجحان نمایاں ہونے لگتا ہے اور محبت کا غلو نفرت کو جنم دیتا ہے اور یہیں محبت کے غلو کے نتیجے میں وجود پذیر ہونے والی نفرت انسانی سماج میں انارکیت کو جنم دیتی ہے۔ محبت انسانی کردار کا مثبت پہلو ہے اور نفرت انسانی کردار کا سلبی پہلو۔ سارتر کا یہ خیال سلبی سوچ کا حامل ہے کہ ایک فرد دوسرے کے لیے دوزخ ہے۔ بلکہ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ایک فرد کا وجود دوسرے کے لیے باعثِ رحمت ہے۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ورنہ اگر کائنات میں زندگی کے ارتقاء کا بغور مشاہدہ کیا جائے تو اس حقیقت کا ادراک حاصل ہوگا کہ محبت و اتصال سے زندگی نمو پاتی ہے اور حیات پروان چڑھتی ہے محبت و اتصال ارتقاء حیات کا بنیادی اصول ہے جب بھی انسانی سماج محبت و اتصال کے اصول پر اپنے سماجی رشتوں کی تشکیل کرے گا وہ روحانیت کی اعلیٰ منازل

پر ہوگا۔ مادیت کی بنیاد پر تشکیل پانے والا فلسفۂ حیات محاربہ، جبر، کشمکش، تنازع للبقا کا مادی فلسفہ، خارج سے داخل کی طرف اور روحانیت کی بنیاد پر متشکل ہونے والا فلسفۂ حیات، محبت و اتصال داخل سے خارج کی طرف اپنا رجحان ظاہر کرتا ہے۔ خارج سے داخل کی طرف آنے میں جبر کا عمل وارد ہوتا ہے اور داخل سے خارج کی طرف آنے میں انسانی رویہ قدری یا اختیاری ہوتا ہے۔ یورپ کا تمام تر فلسفہ چونکہ خارج سے داخل کی طرف رجحان رکھتا ہے اس لیے اس کی اٹھان بھی جبر محض پر ہے جب کہ اسلام کا فلسفہ داخل سے خارج کی طرف رجحان ظاہر کرتے ہوئے "قدر" پر زیادہ اصرار کرتا ہے۔ سرمایہ داریت اور اشتراکیت ایک ہی نظریہ یعنی مادیت کی بیٹیاں ہیں۔ لہٰذا ان کا مزاج ایک ہی ہے اور ان کے فلسفوں کا اطلاقی رجحان خارج سے داخل کی طرف ہے۔ اسی باعث یہ انسانی مسئلہ کو حل نہیں کر سکیں۔

علامہ اقبال کے نزدیک مغربی تہذیب نے یوں انسانی تمدن کی مادیت پر اٹھان رکھ کر اسے بڑی نازک بنیاد فراہم کی تھی اور اسی باعث اس کی خودکشی کے امکانات بڑھتے چلے جا رہے ہیں چنانچہ انہوں نے انسانی تہذیب کو اس کی اصل اور حقیقی اساس روحانیت پر تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس سلسلے میں انہیں سب سے ٹھوس بنیاد مذہب نے فراہم کی۔ اس لیے کہ پوری انسانی تاریخ میں محض مذہب ہی روحانیت کا علمبردار رہا ہے اور محض مذہب ہی وہ اساس فراہم کرتا ہے، جس میں انسانی اعمال اپنے اطلاقی شعور میں داخل سے خارج کی طرف حرکت زن ہوتے ہیں مذہب کا جب علامہ اقبال نے مطالعہ کیا تو انہیں اس شعور سے بہرہ وری ہوئی کہ الہامی مذہب کی اساس ایمان ( ) پر ہے جو عقل کی سب سے اعلیٰ ترین صورت ہے مادیت روحانیت سے یوں بھی پیچھے ہے کہ اس نے اپنی اساس عقل پر رکھی۔ عقل کی برتر صورت الہام اور اس سے بھی اعلیٰ صورت وحی پر وہ اپنی اساس نہ رکھ سکی وحی ایک ایسی قوت تھی جو انسانوں کو ایمان سے بہرہ ور کر سکتی ہے۔ یہی وحی مذہب کی اساس رہی ہے جو انسانی تاریخ میں اس وقت سے جبکہ انسان ابھی عقلی سطح پر بیدار بھی نہ ہوا تھا۔ اس کی رہنما قوت رہی ہے۔ اور وہ انسانی ارتقاء کے ساتھ ساتھ پوری انسانی تاریخ میں پورے تواتر کے ساتھ جاری رہی ہے وحی تین بنیادوں پر اپنی تعلیمات کی اساس رکھتی رہی ہے۔

۱۔ توحید خدا

۲۔ رسالت

(۳) تصورِ معاد

توحید خدا میں کائنات اور زمین پر موجود ہر شے کو خدا کی مخلوق قرار دیا گیا ہے۔ خدا کی ربوبیت پر زور دیا گیا۔ اس کی وحدت اور لاشریک ہونے پر اصرار کیا گیا اور اسے خالق رب اور مالک قرار دے کر اس کی فرمان برداری کو انسانوں کا مقدر ٹھہرایا گیا۔ رسالت کے تصور کے تحت انسانوں اور خدا میں ایک رابطہ کی کڑی کے موجود ہونے پر زور دیا گیا اور خدا اور بندے کے درمیانی رشتہ کی توثیق کی گئی اور ان دونوں کے درمیان اس رابطے کے ذریعے آنے والے پیغامات اور احکام کو صائب قرار دے کر انہیں خدا کے احکام سمجھ کر ادا کرنے پر زور دیا۔ تصورِ معاد کے تحت انسانوں میں جواب دہی کا احساس پیدا کیا گیا۔ کہ جب تم نے پلٹ کر آنا ہے تو یہ بھی بتانا ہے کہ تم خدا کے احکام کو کس قدر بجا لاتے رہے ہو۔ خدا کے احکام کو بجالانے والے سرخرو ہوں گے اور وہ ظالم ہوں گے جو خدا کے احکام سے منہ پھیریں گے اور سرخرو ہونے والوں کو جزا اور ظالموں کو سزا ملے گی۔ تمام انبیاء اور اہلِ مذہب کی تعلیمات ان تین ہی بنیادوں پر استوار رہی ہیں۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ جزوی اختلافات ہیں۔ چنانچہ مذہب انسانی تاریخ کے ساتھ ساتھ وحی کے ذریعے لوگوں میں رائج کیا جاتا رہا ہے۔ حتیٰ کہ نبی آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور انہوں نے پہلے انبیاء کی تعلیمات کی توثیق کی اور ان تمام کی تعلیمات کو جو اسلام ہی تھیں۔ ایک اکمل اور مکمل صورت میں وحی الہٰی قرآن پاک میں پیش کیا۔ یہ پہلا مرحلہ تھا جب خدا نے اپنی وحی کی حفاظت کا ذمہ لیا اور سلسلۂ وحی خود اس رسولؐ کی زباتی ہی ختم کرنے کا اعلان بھی کیا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی برپا کی ہوئی تہذیب اور اس کے اثرات کے تحت برپا ہونے والی یورپی تہذیب کا مکمل طور پر شعور حاصل کرنے کے بعد ہر شخص اس بات کا ادراک کر سکتا ہے کہ اللہ نے کیوں سلسلۂ وحی منقطع کیا۔ انسانی شعور اور تہذیب میں ترقی و ارتقاء نے اس قدر اہلیت پیدا کر دی کہ اب کسی کا وحی الہٰی کو بدلنا آسان نہ رہا اور انسانی شعور نے مختلف علوم کی مدد سے اتنی بصیرت پیدا کر لی کہ وہ وحی الہٰی کی روشنی میں انسانی سماج کی تشکیل و تعمیر خود کر سکے۔ علامہ اقبال نے مذہب کی سب سے اعلیٰ ترین اسی صورت اسلام کو قبول کیا اور اسے عالمگیر سطح پر انسانی سماج کی عہد جدید میں تشکیل کا اصول قرار دیا۔

نظریہ پاکستان کے دو بنیادی ستون

اس سلسلے میں علامہ اقبال کے سامنے دو اہم مسئلے تھے ایک تو اسلام کی تعلیمات کے صحیح شعور کو واضح کرنے اور ان کی تفہیم عام کرنے کا۔ تاکہ مسلمان واضح طور پر اسلامی نظریہ کے خدوخال سے آگاہ ہو سکیں۔ ان کی کتاب "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" مذہب کو آج کے معیارات پر پرکھنے اور پیش کرنے کی ہی سعی سے عبارت تھی۔ اس کے ساتھ وہ تشکیل جدید فقہ اسلامیہ اور قرآن پاک کی جدید افکار و علوم کی روشنی میں تفسیر بھی لکھنا چاہتے تھے مگر موت نے مہلت نہ دی۔ ان تمام کوششوں کا مقصد اسلام کی تعلیمات کو اور غیر ضروری موضوعات سے ہٹا کر ان موضوعات پر اسلام کی تعلیمات کو پیش کرنا تھا جو عصرِ حاضر میں انسانی مسائل کے حل میں معاون ہو سکتے تھے اور ایک نئی تہذیب کے احیاء کے لیے جو بنیاد فراہم کر سکتے تھے اور اس سے ان کا مقصد صدیوں سے اجتہاد کا بند دروازہ کھولنا بھی تھا۔ مگر اس سے کہیں بڑھ کر عالم انسانیت کے سلگتے ہوئے مسائل کو مذہب کی بنیادوں پر حل کرنا تھا۔ علامہ اقبال نے اس مقصد کے لیے پٹھان کوٹ میں دارالسلام کے قیام کا منصوبہ بھی بنایا اور اس مقصد کے لیے سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کو دکن سے پنجاب بلوا کر اپنا شریکِ کار کرنا چاہا۔ مگر وہ منصوبہ علامہ اقبال کی نگرانی میں شروع نہ ہو سکا۔ علامہ اقبال کے نزدیک ایک اہم مسئلہ اسلام کی روحِ عصر کے تقاضوں کے مطابق ایسی جدید تاویل و تعبیر تھی جس سے انسانوں کے لیے روحانیت اور مذہب کی بنیاد پر ایسی تہذیب کی تشکیل کی جا سکے۔ جہاں انسانوں کے درمیان محبت کی عالمگیری قائم ہو۔

دوسرا مسئلہ

دوسرا اہم مسئلہ علامہ اقبال کی نظر میں یہ تھا کہ اسلامی نظریہ کو تجریدیت سے کس طرح بچایا جائے مجرد نظریہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کی حیثیت ایک خوبصورت تصور سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اشتراکیت کی اہمیت بھی اسی وقت مسلّم ہوئی جب لینن نے اسے روس میں نافذ کیا۔ علامہ اقبال اسلام کو محض ایک نظریہ یا مجرد ایک نظامِ حیات کی حیثیت سے نہیں دیکھنا چاہتے تھے بلکہ وہ اسے عملی طور پر

رائج دیکھنا چاہتے تھے۔ان کے شعور میں یہ امر گہرے طور پر جاگزیں تھا کہ اسلام کا حسن و اعجاز اس وقت آشکارا ہو سکتا ہے جب اس کی تعلیمات کے تحت ایک نظریاتی اسلامی سماج تشکیل دیا جائے اور اسلامی نظریہ پر عوام کے عمل کی گرفت ہو۔ اقبال نے اپنی شاعری کے توسط سے عوام میں اسلامی عقیدہ اور نظریہ کی گرفت مستحکم کرنے کی کوشش کی مگر اس کے سامنے ایک ایسی قیادت کا سوال ابھر کر سامنے آیا جو اس اسلامی نظریہ پر غیر متزلزل ایمان کی حامل ہو اور اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ عصرِ حاضر کے علمی اور تہذیبی شعور سے بہرہ ور ہو جو لیورپی زبان سمجھتی ہو جو اتنی طاقتور ہو کہ نام نہاد مسلمانوں کا اسلامی نظریہ کے نفاذ کے خلاف اندرونی دباؤ اور انگریزوں، ہندوؤں اور آسٹرالیکوں کے بیرونی دباؤ کا مقابلہ جرأت مندی سے کر سکے۔ جس کا کردار شفاف ہو اور جو عزم اور ارادوں میں چٹان ہو علامہ اقبال نے خودی کی معراج پر فائز جس مردِ مومن کو اپنی سوچوں کا محور بنایا تھا۔ علامہ اقبال کی فکر کی خوشبختی دیکھئے کہ محسوس اور ٹھوس دنیا میں بعینہٖ وہ ہستی موجود تھی۔جس کے شبنمی کردار سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک بھی پیدا ہوتی تھی اور جس کی سیاست اور ذہانت کے طوفان کے آگے دریاؤں کے دل بھی دہل جاتے تھے جس کی نظر کو جلوہ دانش فرنگ خیرہ نہ کر سکا اور جس نے صداقت، شرافت اور عدالت کے تمام اسباق ازبر کئے ہوئے تھے جس کے دل میں مسلمانوں کے لیے گہری محبت بھی موجزن تھی اور جو اسلامی نشاۃ ثانیہ کے خواب کو حقیقت میں بدلنے کی صلاحیتوں سے بھی بہرہ ور تھا۔ علامہ اقبال نے عملی طور پر مسلمانوں کی مجبوراً قیادت بھی کچھ عرصہ کی مگر وہ فکر تھے اور قائداعظم عمل، عمل پیہم جو اسلامی نظریہ کے یقین محکم سے سرشار تھا۔اب بات محض تنظیم کی تھی۔چنانچہ قائداعظم نے علامہ اقبال سے ایک طویل اور اہم مراسلت کے بعد جب مسلم لیگ کے ذریعے برصغیر میں مسلمانوں کی تنظیم کا بیڑہ اٹھایا تو ان کا وہ اولین قدم اسلامی نظریہ کی ایک سرزمین سے پیوستگی کی تحریک تھا علامہ اقبال نے اسلامی نظریہ کا ہمیں صحیح تشخص دیا۔ اس کا ابلاغ دیا ہمیں قائداعظم کی صورت میں ایک عظیم المرتبت قائد عطا کیا مسلم لیگ کے الہ آباد کے ۱۹۳۰ء کے صدارتی خطبہ کی صورت میں وہ مینی فسٹو بھی دیا جس پر کہ اسلامی نظریہ کی ایک سرزمین سے پیوستگی کی عملی تدبیر دی گئی تھی۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو برصغیر کے مسلمانوں نے قائداعظم کے دستِ مبارک پر اسلامی نظریہ کو برصغیر کے شمال مغربی مسلم اکثریت کے صوبوں اور مسلم اکثریت کے مشرقی صوبے بنگال کے علاقوں میں پیوست کرنے کے لیے

اسلامی نظریاتی مملکت پاکستان کے قیام کو اپنی جدوجہد کا محور بنانے کا فیصلہ کیا اور یوں قائداعظم کی قیادت میں فکرِ اقبال کو ایک حساس قالب میں ڈھالنے کی تدبیر کا آغاز ہوا۔ اگر علامہ اقبال نہ ہوتے تو نہ جانے برصغیر کے مسلمانوں کا مقدر کس طرح بنتا بگڑتا۔ اور اس طرح اگر قائداعظم نہ ہوتے تو علامہ اقبال کا نظریہ تجرید کا شکار ہو جاتا اور برصغیر کے مسلمانوں کا مقدر ہندوؤں اور مسلمانوں کے نادان مسلم رہنماؤں کے رحم و کرم پر ہوتا۔ یہ سوال نہایت بودا اور طفلانہ ہے کہ علامہ اقبال بڑے تھے یا قائداعظم عظمتِ فکر کے عظیم مینار علامہ اقبال تھے اور عملِ پیہم کے رفیع الشان مینار حضرت قائداعظم محمد علی جناح تھے۔ علامہ اقبال اور قائداعظم پاکستان کے فکری اور عملی معمار ہیں ان دونوں کے فکر و عمل اور باہمی تعاون، خلوص اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش۔ ایک دوسرے کے لیے وفاداری اور ایثار نے برصغیر میں ایک طرف تو اسلامی نظریہ کی ایک سرزمین سے پیوستگی کے امکان کو ایک محسوس قالب میں ڈھالا اور دوسری طرف برِصغیر کے مسلمانوں کے ثقافتی وجود کے تحفظ میں کامیابی حاصل کی۔

"خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ اور جدید تصورات کی روشنی میں اس کو وسیع تر کرنے میں اس مسئلہ کا حل نکل آیا ہے۔ اسلامی قانون کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر اس نظامِ قانون کو اچھی طرح سمجھ کر عملی جامہ پہنایا جائے تو کم از کم ہر فرد کے معاشی حقوق کا تحفظ ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی توسیع ایک آزاد مسلم مملکت یا چند مملکتوں کے بغیر ممکن نہیں"۔ [۱]

چنانچہ اسلام کے معاشی نظام کے عملی صورت میں نفاذ کے لیے برِصغیر کے مسلمانوں کو ایک ایسی مملکت کی ضرورت تھی جس پر انہیں تصرف و اختیار حاصل ہو عہدِ جدید میں کوئی قوم معاشی طور پر خود کو مستحکم بنائے بغیر اور معاشی طور پر ایک مضبوط نظام کو استوار کئے بغیر اپنا تشخص قائم نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ برِصغیر کے مسلمانوں کو پاکستان کی ضرورت اس لیے تھی کہ وہ اشتراکیت اور سرمایہ داریت دونوں سے ہٹ کر منفرد طور پر اپنا معاشی نظام وجود میں لائیں۔

(۱) اقبال کے خطوط جناح کے نام، ترجمہ عبدالرحمٰن سعید، مئی ۱۹۳۷ء

سوال یہ ہے کہ مسلمان برصغیر میں ہندوؤں کے ساتھ رہ کر ایسا کیوں نہیں کر سکتے تھے۔ کہ معاشی طور پر توانا ہوں۔ اس کا جواب نہایت واضح طور پر اقبال نے دیا کہ

" دستورِ جدید نے کم از کم ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اس امر کا ایک نادر موقع فراہم کیا ہے کہ ہندوستان اور مسلم ایشیا میں آئندہ سیاسی ترقیوں کے پیشِ نظر ہندوستان کے مسلمان اپنی تنظیم کر لیں۔" [1]

پھر علامہ اقبال کو اس امر کا بھی گہرا ادراک تھا کہ

" ایشیا میں اخلاقی اور سیاسی قوت کی صورت میں اسلام کا مستقبل زیادہ تر ہندوستانی مسلمانوں کی مکمل تنظیم پر منحصر ہے۔" [2]

ہندوستان اور مسلم ایشیا میں آئندہ سیاسی ترقیوں سے مراد مسلمانوں میں بیداری کی تحریکات کا ابھرنا اور قوموں کے حق خود ارادیت کی بنیاد پر نوآبادیاتی نظام کے تارو پود کا بکھرنا اور عوام کے ہاتھ اقتدار کا منتقل ہونا تھا اب جہاں تک دیگر مسلمان ممالک کا تعلق تھا وہاں مسلمان اکثریت میں تھے لہذا قوموں کے حقِ خود ارادیت اور جمہوری حق کے پیشِ نظر انہیں ہر قیمت پر اقتدار اعلیٰ منتقل ہونا تھا۔ مگر برصغیر میں مسلمان ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے زندہ تو تھے مگر انہیں اقتدار منتقل ہونا ممکن نہیں تھا اس لیے کہ ہندو برصغیر میں ایک اکثریتی قوم کی حیثیت سے زندہ تھے مسلمانوں کی اکثر تحریکیں اس امر پر اپنی اساس رکھتی تھیں کہ اقتدار چونکہ مسلمانوں سے لیا گیا تھا۔ لہذا اقتدار واپس بھی انہیں ہی منتقل ہونا چاہیئے اور وہ پورے ہندوستان پر مسلمانوں کے دوبارہ اقتدار کے لیے مسلمانوں کو منظم کر رہے تھے مگر اس عسکری تنظیم میں کمزوری تھی کہ ان رہنماؤں کے ہاں دورِ جدید میں حقِ خود ارادیت کے تصور کے ابھرنے کی بناء پر پیدا شدہ شعور کا فقدان تھا اگر مسلمان پورے برِصغیر کا اقتدار عسکری قوت کی بناء پر حاصل بھی کر لیتے تو ان کے لیے زیادہ عرصہ اس کو اپنے قابو میں رکھنا ممکن نہ ہوتا اور برِصغیر ایک خانہ جنگی میں مبتلا ہو جاتا اور اس میں اندیشہ یہی تھا کہ ایک

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام۔ ترجمہ عبدالرحمٰن سعید، مئی ۱۹۳۷ء

[2] ایضاً

تنظیمی اور اقتصادی طور پر توانا اکثریت ایک بدحال اقلیت کو نگل جاتی۔ چنانچہ برصغیر کے مسئلہ کا پرامن حل اس سے بہتر نہ تھا کہ برصغیر کی دونوں بڑی قوموں کو حقِ خود ارادیت کی بناء پر اقتدار علیحدہ علیحدہ طور پر ان کے اکثریتی خطوں میں منتقل کر دیا جائے اور یہی ہوا اور اس سے وہ ثقافتی مسئلہ حل ہوا۔ جس کی طرف علامہ اقبال نے ۳۰ مارچ ۱۹۳۷ء کے قائداعظم محمد علی جناح کے نام مکتوب میں کیا ہے اس کا بنیادی تصور اسلامی نظریہ کی ایک سرزمین میں پیوستگی پر مبنی تھا۔

نظریہ پاکستان کا مضبوط وکیل

قائداعظم محمد علی جناح نے گرچہ دادا جی نوروبھائی اور مسٹر گوکھلے کے ساتھ یا ان کی متابعت میں عملی سیاست میں شروع شروع میں دلچسپی لی۔ مگر شروع میں ان کی سرگرمیوں کا محور و مرکز محض نوآبادیاتی نظام کے تسلط سے ہندوستانیوں کو نکالنے تک ہی محدود تھا۔ چنانچہ کلکتہ اجلاس میں جب انہوں نے کانگریس میں شرکت کی تو ان کے سامنے ہندو یا مسلم قوم کا تصور نہ تھا۔ بلکہ ہندوستانیوں کا مسئلہ ان کے پیشِ نظر تھا۔ بظاہر کانگرس اس بات کی ہی مدعی تھی کہ وہ ہندو یا مسلم کی نہیں بلکہ برصغیر کے تمام باشندوں کی نمائندہ جماعت ہے اور وسیع تر مفہوم میں اس کے پیشِ نظر نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ اور ہندوستان کی آزادی ہے۔ قائداعظم نے جب کانگریس میں شرکت کی تو انہوں نے بھی ہندو مسلم اتحاد کے لیے کام کیا جس کے نتیجے کے طور پر بمبئی میں جناح ہال تعمیر ہوا اور ہندوؤں نے انہیں "پیمبر امن" کا خطاب دیا۔ ذاتی طور پر قائداعظم شروع میں مخلوط انتخاب کے حامی تھے گرچہ بعد میں مسلمانوں کی خواہش کے احترام میں جداگانہ انتخاب کے لیے زور دیتے رہے قائداعظم اور کانگرس کا اختلاف سب سے نمایاں طور پر نہرو رپورٹ کی اشاعت پر منظرِ عام پر آیا۔ برصغیر کے تمام مسلمانوں نے متفقہ طور پر اس رپورٹ کو رد کیا خود ہندوؤں کے لیڈروں نے جن میں ایس سی بوس اور چمن لال ستیواڈ شامل تھے۔ نہرو رپورٹ کو ہندو مسلم مسائل کو حل کرنے کا بہترین موقع ضائع کرنے کا موجب قرار دیا۔[۱] مولانا شوکت علی نے نہرو رپورٹ پر تبصرہ کرتے

ہوئے کہا تھا کہ

"جوانی میں مجھے شکاری کتے پالنے کا بہت شوق تھا مگر میں نے کبھی کسی شکاری کتے کو خرگوش کے ساتھ ایسا سلوک کرتے نہیں دیکھا۔ جیسا نہرو رپورٹ میں مسلمانوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔" ۱

مشہور انگریزی اخبار ٹائمز نے اس رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا

"اسمبلی میں مسلمانوں کے احساسات کی یک جہتی غیر متوقع اور ان لوگوں کے لیے پریشان کن تھی جو نہرو رپورٹ کو ہندوستان کے متفقہ مطالبہ کی شکل دے رہے تھے اس لیے ایسا دعویٰ مضحکہ خیز نظر آتا ہے۔"

ڈاکٹر خورشید کمال عزیز نے نہرو رپورٹ کو ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں کا نقطہ اختتام قرار دیا اور کہا کہ اس نہرو رپورٹ کے پیش ہونے اور اس میں ترمیم کو نامنظور کر کے ہندوؤں نے مسلمانوں سے تعلق ہمیشہ کے لیے منقطع کر لیا ہے ان کے الفاظ ہیں۔

"خلافت تحریک کے ختم ہوتے ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کا مختصر ہنی مون ختم ہو گیا اور مخالفت اور عناد نے ایک مرتبہ پھر سر اٹھایا۔ مگر اس مرتبہ اس کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا اور ان دونوں کے اتحاد کے کوئی امکانات باقی نہ رہ گئے تھے، نہرو رپورٹ نے اس کی کشیدگی پر مہر لگا دی اور ہندوستان میں امن ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا۔" ۲

قائداعظم محمد علی جناح جنہیں ہندو مسلم اتحاد کا سفیر خیال کیا جاتا تھا انہوں نے نہرو رپورٹ کی منظوری اور اپنی ترامیم کے ٹھکرائے جانے پر صرف اس قدر تبصرہ کیا کہ:

"This is the parting of the ways" ۳

نہرو رپورٹ کے بعد قائداعظم نے ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں کو ترک کر دیا اور انہوں نے

1- Seetalvad chamenlal, Recollection and Reflection, Bombay 1946

2- Khalid Bin Sayeed, Pakistan, the formative Phase, Karachi, 1960.

۳- احمد سعید پروفیسر، حصولِ پاکستان، ایجوکیشنل ایمپوریم، لاہور، ص ۱۸۲

مارچ ۱۹۲۹ء میں دہلی میں لیگ کا اجلاس طلب کرکے وہاں اپنے مشہور چودہ نکات پیش کیئے جو یہ تھے۔

(۱) آئندہ آئین وفاقی ہو جس میں تمام غیر مفید معاملات صوبوں کے حوالے کئے جائیں۔

(۲) تمام صوبوں کو مکمل خود مختاری حاصل ہو اور انہیں یکساں اختیارات دیئے جائیں۔

(۳) ملک کی تمام اسمبلیوں اور انتخابی اداروں میں اقلیتوں کو موثر نمائندگی دی جائے اور کسی قوم کی اکثریت کو اقلیت یا برابری میں تبدیل نہ کیا جائے۔

(۴) مرکزی قانون ساز اسمبلی میں مسلمانوں کو کم از کم ایک تہائی نمائندگی دی جائے

(۵) جداگانہ انتخابات کا طریقہ جاری رہے اور اگر کوئی قوم اپنی مرضی سے مخلوط انتخاب کو پسند کرے تو اس کو اس کی اجازت دی جائے۔

(۶) اگر کسی وقت صوبوں کی حدود کا از سرِ نو تعین کیا جائے تو یہ تبدیلی بنگال، پنجاب اور صوبہ سرحد میں مسلمانوں کی اکثریت پر اثر انداز نہ ہو

(۷) تمام قوموں کو مکمل مذہبی آزادی، آزادی ضمیر، آزادی عبادت و رسومات، آزادی تعلیم و تبلیغ اور آزادیِ اجتماع کی ضمانت دی جائے۔

(۸) کوئی بل قرارداد یا تحریک کسی بھی قانون ساز اور انتخابی ادارہ میں پیش نہ کی جائے۔ اگر اس بل سے متاثرہ قوم کے تین چوتھائی لوگ اس کی مخالفت کریں۔

(۹) سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرکے جداگانہ صوبہ کی حیثیت دی جائے

(۱۰) دیگر صوبوں کی مانند سرحد اور بلوچستان میں بھی اصلاحات جاری کی جائیں۔

(۱۱) مسلمانوں کو بشرط قابلیت سرکاری اور خود مختار اداروں میں دیگر ہندوستانیوں کے پہلو بہ پہلو ملازمتیں دی جائیں

(۱۲) دستور میں ایسے تحفظات رکھے جائیں جن سے اسلامی تہذیب و ثقافت کا تحفظ ہو سکے، اور مسلمانوں کی تعلیم میں ترقی ہو اور ان کی زبان، خانگی قوانین اور اوقاف کا تحفظ ہو سکے۔

(۱۳) مرکزی اور صوبائی وزارتوں میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی دی جائے اور ان کی شمولیت کے بغیر کوئی بھی کابینہ ترتیب نہ دی جائے۔

(۱۴) دستور میں اس وقت تک کوئی تبدیلی یا ترمیم نہ کی جائے۔ جب تک وفاق میں شامل تمام

صوبے اور ریاستیں اس ترمیم یا تبدیلی کی منظوری نہ دے دیں۔[1]

یہ مطالبات مبنی برحق تھے اور اس سے کسی قوم کا استحقاق مجروح نہیں ہوتا تھا۔ ان مطالبات کے پیش کرنے کا مقصد محض مسلمانوں کے برصغیر میں حقوق کا تحفظ تھا کہ ایک منفرد اور علیحدہ قوم کی حیثیت سے مسلمانوں کے وجود کو تسلیم کیا جائے اور ان کی ثقافتی، مذہبی، معاشی اور سیاسی فلاح کو پیشِ نظر رکھا جائے ان نکات میں کسی قوم سے اظہارِ نفرت بھی نہیں کیا گیا تھا اور نہ ان کا مقصد کسی قوم کو نیچا دکھانا تھا۔ یہ ایک مثبت اقدام تھا کہ جب برصغیر میں دو قومیں ہیں تو ایک قوم کی حیثیت سے مسلمانوں کو اپنی معاشی، تہذیبی و ثقافتی اور مذہبی انفرادیت کے تحفظ کا حق حاصل ہے جب کانگریس نے قائداعظم کے یہ چودہ نکات نامنظور کئے تو اس کے بعد ہندو مسلم اتحاد کا سوال تو ختم ہو گیا مگر قائداعظم نے برصغیر کی آزادی کے لیے پھر بھی دونوں قوموں کے کم از کم معاملات پر اتفاق کی گنجائش رکھی اور اس کے لیے انہوں نے ہمیشہ ہندوؤں سے تعاون حاصل کرنے کی سعی کی۔ مگر جب ہندوؤں نے کسی بھی معاملہ پر تعاون و اتفاق نہ کرنے کی رو اپنائی تو مسلمانوں کے سامنے اپنے ملّی وجود کے برقرار رکھنے کا سوال ابھر کر سامنے آیا کہ وہ کس طرح برصغیر میں اپنا سیاسی مستقبل محفوظ کر سکتے ہیں۔ یہیں حکیم الامت علامہ سر محمد اقبال نے مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ انہوں نے دسمبر ۱۹۳۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الٰہ آباد کے صدارتی خطبہ میں برِصغیر کے مسلمانوں کے مسائل کا تفصیلاً جائزہ لیا اور انہیں مشورہ دیا کہ:-

"میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔ خواہ یہ ریاست سلطنتِ برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے خواہ اس کے باہر مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی"۔[2]

اس کی وجہ علامہ اقبال نے یہ بتائی کہ

---

[1] ایضاً، صفحات ۱۸۳، ۱۸۴

[2] علامہ اقبال - خطبات علامہ اقبال - مرتبہ رضیہ فرحت بانو۔ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی، بار اول ۱۹۴۶ء، ص ۳۶

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام، بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقہ میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے"۔[1]

وطنی قومیت اور مسلم قومیت میں تصادم

اس سے قبل اس خطبہ میں علامہ اقبال نے اسلام اور قومیت کے عنوان سے کانگریس اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے نظریہ قومیت کو رد کیا۔ جس کے تحت وہ برصغیر میں ہندوستانی نیشنلزم کا پرچار کر رہے تھے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک ہی قوم متصور کر رہے تھے۔[2] علامہ اقبال نے قومیت اسلام کے تصور کو اپنی نظم و نثر دونوں میں واضح طور پر بیان کیا ہے انہوں نے اسلامی تصورِ قومیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس خطبہ میں کہا:۔

"دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی جماعتِ اسلامی کی ترکیب صرف روحِ اسلام ہی کی رہین منت ہے اس لیے کہ اسلامی تمدن کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح کارفرما ہے میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر وہ اتحاد اور ان کی نمایاں

---

[1] خطبات اقبال۔ مرتبہ رضیہ فرحت بانو، ص ۳۷

[2] مولانا حسین احمد مدنی جو کہ ہندوستانی نیشنلزم کے پرچارک تھے ان کے بارے میں علامہ اقبال نے ارمغان حجاز میں فرمایا:۔

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ
زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز نام محمدؐ عربی است
بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

(کلیاتِ اقبال، ص ۶۹۱۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز حصہ اردو لاہور)

یکسانیت، ان قانونوں اور اداروں کی شرمندہ احسان ہے جو تہذیب اسلامی سے وابستہ ہیں "۔ ۱

اس بات کو علامہ اقبال نے خود قائداعظم کے نام ایک مکتوب میں بھی پیش کیا۔ کہ

" مجھے یقین ہے کہ آپ اس حقیقت سے آگاہ ہوں گے کہ دستورِ جدید نے کم سے کم ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اس امر کا ایک نادر موقع فراہم کیا ہے کہ ہندوستان اور مسلم ایشیا میں آئندہ سیاسی ترقیوں کے پیشِ نظر ہندوستان کے مسلمان اپنی تنظیم کریں. جب کہ ہم ملک کی دیگر ترقی پذیر جماعتوں کے ساتھ اتحاد عمل پر آمادہ ہیں ہمیں یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ ایشیا میں اخلاقی اور سیاسی قوت کی صورت میں اسلام کا مستقبل زیادہ تر ہندوستانی مسلمانوں کی مکمل تنظیم پر منحصر ہے "۔ ۲

علامہ اقبال نے اسی خط میں قائداعظم پر زور دیا کہ :-

" میری تجویز ہے کہ آل انڈیا نیشنل کنونشن کو ایک موثر جواب دینا چاہیئے۔ آپ کو چاہیئے کہ دہلی میں آل انڈیا مسلم کنونشن کا ایک اجلاس فوراً منعقد کریں اور اس میں جدید صوبہ داری مجالس مقننہ کے ارکان اور دوسرے ممتاز مسلم قائدین کو دعوت دیں۔ اس کنونشن میں ممکنہ قوت کے ساتھ ایک ممتاز سیاسی وحدت کی حیثیت سے ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی نصب العین کو دوبارہ بیان کیا جائے۔ ہندوستان کی اندرونی اور بیرونی دنیا پر یہ امر واضح کر دینا نہایت ضروری ہے کہ معاشی مسئلہ ہی ملک کا تنہا مسئلہ نہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے ہندوستان اکثر و بیشتر مسلمانوں کے لیے ثقافتی مسئلہ کے طور پر اہم نتائج کا حامل ہے۔ بہرحال معاشی مسئلہ کے مقابلہ

---

۱ علامہ اقبال۔ خطباتِ اقبال۔ ترجمہ و مرتبہ رضیہ فرحت بانو، حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۹۶ء، ص ۲۶، ۲۷۔

۲ علامہ اقبال۔ اقبال کے خطوط، جناح کے نام۔ ترجمہ عبدالرحمٰن سعید۔

۳ ایضاً۔

میں اس کو کچھ کم اہمیت حاصل نہیں ہے۔" [1]

علامہ اقبال نے اپنے خطبہ الہ آباد میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا۔ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مسئلہ پر گہری سوچ و بچار کے حامل تھے۔ مسلمانوں کے دورِ اقتدار میں مسلمانوں کو کبھی اپنے قومی تشخص کو خطرہ محسوس نہیں ہوا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ہندوؤں نے انگریزوں کے ساتھ مفاہمت کر لی اور وہ انگریزی اقتدار کے ساتھ وابستہ رہ کر اپنی نشاۃ ثانیہ کی کوشش میں مصروف ہو گئے اور انہوں نے اپنے سابقہ حکمرانوں کو ایک حریف کے طور پر محسوس کیا اور بتدریج ان کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا اس لیے کہ انہیں اس بات کا شعور حاصل تھا کہ ایک چھوٹی سی سلطنت برطانیہ جو کسی نظریہ کے تحت نہیں بلکہ محض معاشی اغراض کے لیے قوت کے بل پر ہندوستان پر قابض ہوئی ہے زیادہ عرصہ اپنا اقتدار قائم نہیں رکھ سکے گی۔ ایک نہ ایک دن اسے جانا ہی ہوگا۔ اس لیے اس کی ان سے مخاصمت بے کار ہے ان کے جانے کے بعد ان کے حریف ان کے سابق حکمران ہوں گے لہذا ان کو ختم کرنے کے لیے انگریز کی مدد لینی ضروری ہے چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو سیاسی، سماجی، معاشی، تعلیمی اخلاقی طور پر دبانا شروع کیا۔ ۱۹۰۰ء کے آغاز کے ساتھ ہی ہندوؤں نے عالمی سطح پر برطانوی نوآبادیت کے قدم اکھڑتے ہوئے محسوس کئے چنانچہ انہوں نے ہندوستانی نیشنلزم کے نام سے ہندوستان کے تمام باشندوں کو اکٹھا کرنے کی کوششیں کانگریس کے تحت شروع کر دیں۔ اب ان کے سامنے مسلمانوں کو ساتھ ملانے کا سوال تھا مسلمانوں کو بالکل نظر انداز کر کے رام راج کا ان کا منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا کہ برصغیر میں مسلمان ایک متحد اور باقوت قوم کی حیثیت سے اپنا تشخص رکھتے تھے چنانچہ انہوں نے جلد بازی بھی دکھائی اور مسلمانوں کی اسلامی اور ثقافتی انفرادیت کو بھی کچلنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ جس سے مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئیں اور انہیں اپنے ثقافتی وجود کے تحفظ کی فکر دامن گیر ہوئی۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ، سرسید احمد خاں اور سید امیر علی نے مسلمانوں کے انفرادی تشخص کو ابھارنے اور دو قومی نظریہ کی تخم ریزی کرنے میں اہم کردار ادا کیا علامہ اقبال نے خطبہ الہ آباد میں اس دو قومی نظریہ کو ایک محسوس اور مربوط قالب عطا کرتے ہوئے اس

[1] علامہ اقبال۔ اقبال کے خطوط، جناح کے نام۔ ترجمہ عبدالرحمٰن سعید۔

بات کا اعلان کیا کہ مسلمانوں کے مستقبل کا تحفظ اور ان کے ثقافتی مسئلہ کا واحد حل شمال مغربی ہندوستان میں ایک آزاد ریاست کا قیام ہے پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد جب برطانوی حکومت نے ہندوستان چھوڑ دینے کا اعلان کیا تو یہ سوال ایک مرتبہ پھر ابھر کر سامنے آیا کہ قوموں کے حقِ خود ارادیت کے تحت اور جمہوریت کے نئے تصورات کے تحت مسلمانوں کے ثقافتی وجود کا انحصار ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہوگا۔ اس لیے کہ عسکری طور پر مسلمان ہندوستان کو زیر نگیں نہیں کر سکتے اور جمہوری طور پر اقتدار بڑی قوم یا ہندوستانی باشندوں کی اکثریتی قوم ہندو کو منتقل ہوگا۔ علامہ اقبال نے برصغیر کے مسلمانوں کے اس ثقافتی مسئلہ کا حل یہ تجویز کیا کہ برصغیر میں اپنے منفرد طور پر تشخص کرنے والے نظریہ اسلام کی تشکیل کرنے اور اسے تمدنی قوت بنانے کے لیے اور اسے محسوس قالب دینے کے لیے شمال مغربی مسلم اکثریت کے خطوں میں اس کی پیوستگی کریں۔ یہی تصورِ پاکستان کو ایک مثبت اساس فراہم کرتا ہے قائداعظم محمد علی جناح نے بھی ہندوستان کی مخصوص ثقافتی اور سیاسی صورت حال کا بغور مشاہدہ کیا اور ہندوؤں سے اتحاد کی ہر کوشش کو ناکامی سے دوچار ہوتے دیکھا تو بالآخر یہی نتیجہ اخذ کیا کہ برصغیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا یک جا ہونا آگ اور پانی کا ملاپ ہے اور یہ مسلمانوں کے نظریہ اسلام کو عملی طور پر نافذ کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ مسلمان محض اسی وقت اثباتی طور پر اسلامی نظریہ کو اپنی زندگیوں میں رچا بسا سکیں گے جب کہ وہ خود بااختیار ہو کر اسے نافذ کرنے کے قابل ہوں گے ہندو میں اتنا ظرف نہیں کہ وہ مسلمانوں کے نظریہ حیات کو ثمر آور ہونے دے۔ قائداعظم نے علامہ اقبال کے اخذ کردہ نتائج کو قبول کیا اور کہا کہ وہ خود بھی بعد میں حالات کے مطالعہ سے مسلمانوں کے ثقافتی مسئلہ کے تحفظ کے بارے میں اقبال کے نظریات سے مکمل طور پر متفق ہوئے اور ہم دونوں کے نظریات میں کامل ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ آپ فرماتے ہیں۔

> "میرے اور مرحوم کے خیالات میں کاملاً ہم آہنگی پائی جاتی ہے ہندوستان کے دستوری مسائل کے گہرے مطالعہ کے بعد بھی انجام کار مجھے یہی نتائج اخذ کرنے پڑے اور بالآخر ان ہی خیالات سے مسلم ہندوستان کے متحدہ عزم کی صورت میں جنم لیا۔ جس کو کل ہندوستان مسلم لیگ کے اجلاس لاہور منعقدہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی تجویز میں متشکل کیا گیا جو عام طور پر قراردادِ پاکستان کے نام سے موسوم کیا

جاتا ہے"۔[1]

نظریہ پاکستان پر علامہ اقبال کے پہنچنے کا عملی فکری وجدانی اور سیاسی حالات کے وہبی مطالعہ پر مبنی تھا۔ جب کہ قائداعظم اس نتیجہ پر ایک سیاسی عمل کے ذریعے پہنچے۔ مگر دونوں رہنماؤں کا اخلاص اور ان میں ہونے والی خط و کتابت نے انہیں مسائل کو سمجھنے کے بہتر مواقع عطاء کئے اور وہ دونوں ایک ہی نتیجے پر پہنچے۔ اور وہ نتیجہ یہ تھا کہ اسلام کو اگر برصغیر میں ایک مستند اور متحرک قوت کے طور پر اپنا تشخص منفرد طور پر قائم کرنا ہے تو اسے تجریدیت سے بچنا ہوگا اور عملی صورت میں اپنی پیوستگی ایک ایسی سرزمین سے کرنی ہوگی جہاں کہ اس کے ماننے والوں کی اکثریت ہے اور جب علامہ اقبال اور قائداعظم نے ہندوستان کی جغرافیائی صورت حال کا جائزہ لیا تو انہیں پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان اور کشمیر پر مشتمل ایک مسلم اکثریت کے علاقوں کی پٹی نظر آتی جو آپس میں مربوط اور جغرافیائی طور پر ہم آہنگ، عسکری طور پر قابلِ قبول اور معاشی وسائل کے لحاظ سے خود کفیل تھی، ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء میں جب سر فضل الحق نے قائداعظم کی قیادت میں منٹو پارک جسے کہ اب اقبال پارک کہا جاتا ہے اس جگہ جہاں کہ اب مینارِ پاکستان شکوہ و جلال سے ایستادہ ہے قرار دادِ پاکستان منظور کی تو اس میں بنگال کو بھی شامل کر لیا گیا۔ پاکستان کا نام اس پٹی کو چودھری رحمت علی نے عطا کیا تھا فکر اس کے پیچھے علامہ اقبال کی تھی۔ برصغیر کے مسلمانوں کی بپھری ہوئی قوت اس کی پشت پناہ تھی اور قائداعظم کے ذوقِ عمل اور حسن تدبیر نے اسے ایک نظریہ سے اور ایک تصور سے ایک حقیقت بنا کر منصہ شہود پر لانے کا تاریخی کردار ادا کیا۔ چنانچہ قائداعظم کے الفاظ میں پاکستان کی تحریک نہ انگریزوں کی چال ہے اور نہ ہندوؤں کی تنگ نظری اس کی وجہ جواز بنی بلکہ اس کے قیام کی اصل وجہ مسلمانان برصغیر کا یہ شعور تھا کہ وہ اسلام کو اپنی زندگیوں کا جزو بنائیں اور اسلام کو عہدِ حاضر میں ایک قوت کے طور پر ابھاریں اور سرمایہ داریت، اشتراکیت اور ان کی جڑ مادیت کے ہاتھوں انسانیت جس قدر ہلاک ہو چکی ہے اس سے انسانوں کو نجات دلائیں اور روحانیت کی بنیاد پر

---

[1] قائداعظم، پیش لفظ۔ اقبال کے خطوط جناح کے نام، ترجمہ عبدالرحمٰن سعید، دارالاشاعت اردو، حیدر آباد دکن۔

قائم ہونے والی اسلامی تہذیب کا احیاء کریں تاکہ آج کے انسان کو ایک صحیح نظریۂ حیات میسّر آسکے اور پوری دنیا میں انسانوں کو سکھ، امن چین اور فارغ البالی حاصل ہو۔ قائداعظم نے تحریکِ پاکستان کے اس اثباتی پہلو کو یوں بیان کیا تھا کہ

"آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبے کا جذبہ محرکہ کیا تھا۔ مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جواز کیا تھی؟ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے نہ انگریزوں کی چال۔ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا"۔ [۱]

قائداعظم کی فکر کی روشنی میں اگر تحریکِ پاکستان یا نظریہ پاکستان کا مطالعہ کریں تو اس امر سے آگاہی ہوتی ہے کہ برصغیر میں جب پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تو پاکستان کی نظریاتی تحریک کا آغاز ہو گیا تھا۔ ایک ہزار سال ہم بلاشرکت غیرے برصغیر پر حکمران رہے اور یہی تحریک انگریزوں اور ہندوؤں سے آویزش کے بعد جب بلوغت کو پہنچی تو اس نے خود کو پاکستان کے محسوس قالب میں ڈھال لیا۔ قائداعظم کے الفاظ میں:۔

"پاکستان اس دن وجود میں آگیا تھا۔ جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔ تھا یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمۂ توحید ہے، وطن نہیں اور نہ ہی نسل۔ ہندوستان میں جب پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہیں رہا۔ وہ ایک جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا۔ ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آگئی"۔ [۲]

چنانچہ پاکستان ہندوؤں سے ڈر کر مسلمانوں کے برصغیر کے ایک گوشہ میں چھپنے کی تحریک نہیں تھی بلکہ تحریکِ پاکستان کا اثباتی پہلو اسلامی نظریہ کی ایک مسلم اکثریت والے صوبوں کی سرزمین میں عملی طور پر پیوستگی کی ایک تحریک تھی اور اس کا مقصد اسلام کے روحانی نظریۂ حیات کی روشنی میں

---

[۱] قائداعظم۔ خطاب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۸ مارچ ۱۹۴۴ء

[۲] قائداعظم محمد علی جناح۔ خطبہ علی گڑھ، ۸ مارچ ۱۹۴۴ء

ایک ایسا سماج تشکیل کرنا تھا جہاں انسان مادیت کے انفرادیت پسند یعنی سرمایہ داریت اور اس کے اجتماعیت پسند روپ یعنی اشتراکیت کے ہاتھوں پسنے سے محفوظ ہو کر اپنی خودی یا ذات کی تشکیل و تعمیر کر سکے جہاں سماج فرد کی شخصیت کی تعمیر پر اپنی تمام تر توجہ دے اور فرد سماج کو حسین، شفیق اور خوب تر بنانے میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر انسانیت کے لیے امن اور سلامتی کا بشیر بن سکے۔ یہی نظریہ پاکستان تھا اور اس کے لیے برصغیر کے مسلمانوں نے معصوم جانوں اور اپنے شہیدوں کے لہو کا نذرانہ پیش کیا تھا۔

نظریہ پاکستان کو محسوس قالب میں ڈھالنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم نظریہ پاکستان کو اس کے صحیح سیاق و سباق میں سمجھیں اور نظریہ پاکستان کو محض ایک نعرہ نہ بنائیں اور اس کو ایسے اداروں اور منصوبوں میں متشکل کریں جس سے عوام کو ایک خوش کن نعرے سے کہیں زیادہ نظریہ پاکستان اپنے اندر رچا بسا ہوا محسوس ہو اور عوام محسوس کریں کہ اس کے بغیر یقیناً ان کے مسائل کا کوئی حل نہیں تھا چنانچہ جدید دور کے تقاضوں، مسائل اور مبارزتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہم سمجھتے ہیں کہ نظریہ پاکستان ہمارے ملی اور قومی تشخص کی ایک اساسی ضرورت ہے دوسرے جب تک ہم نظریہ پاکستان کے تحت ایسے ادارے تشکیل نہیں دیتے جو پاکستانیوں کو ان کے پاکستانی اور اسلامی تشخص کا شعور و ابلاغ دیں اس وقت تک یہ نظریہ ایک محسوس قالب اختیار نہیں کر سکتا۔

عصرِ حاضر میں پوری دنیا میں ملّی، قومی، سیاسی اور ذاتی تشخص کی تفہیم کی بہت سی تحریکیں ابھری ہیں۔ عصرِ حاضر کے نوجوانوں کا ایک بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ کون ہیں کیا ہیں اور انہیں کیا کرنا ہے۔ نوآبادیاتی نظام نے نوعِ انسانی کو یہ تحفہ بھی دیا ہے کہ اس نے افراد اور اقوام سے ان کا ملّی، قومی، نسلی، ثقافتی اور عمرانی تشخص چھین لیا اور اقوام کو مصنوعی طور پر مغربی تہذیب و ثقافت کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی ان اقوام کے اپنے ادارے تباہ کر دیئے ان کے معاشرتی اور عمرانی خصائص چھین لیے اور ان کے کردار کا انفرادی حسن نوچ لیا۔ نوآبادیاتی نظام کے بندھن ٹوٹتے ہی نوآبادیاتی نظام کے چنگل میں جکڑے ہوئے عوام اور اقوام کے سامنے یہ سوال آن کھڑا ہوا کہ وہ کون ہیں۔ ان کا ثقافتی، ملّی اور عمرانی تشخص کیا ہے نظریہ پاکستان ہمیں اسی سوال کا

جواب دیتا ہے اور وہ وہ نظریاتی اساس تصور کرتا ہے جس پر کہ ہم اپنے ملی اور قومی تشخص کی اساس رکھ سکتے ہیں اور اسی نظریاتی قومی اور ملی اسلامی تشخص کے تحت ایسے عمرانی، ثقافتی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی ادارے تشکیل دے سکتے ہیں جو ہمیں صحیح معنوں میں اپنا تشخص ابھارنے میں معاون ہوں

دوسرے نظریہ پاکستان کا جو اساسی پہلو ہے وہ معاشی اور سماجی انصاف کی فراہمی ہے۔

جیسا کہ ہم پوری تفصیل سے بتا آئے ہیں کہ علامہ اقبال نے روٹی کے مسئلہ کو ایک اساسی مسئلہ قرار دیا اور اسے ایک مبارزت کے طور پر قبول کرنے کو کہا قائداعظم کے نام ان کے خطوط اس بات کے غماض ہیں کہ علامہ اقبال کو سماجی اور معاشی انصاف کی ضرورت کا بڑا احساس تھا چنانچہ ہمیں نظریہ پاکستان کے تحت سماجی انصاف اور معاشی عدل کے قیام کے ادارے تشکیل دینے ہوں گے جس سے پاکستان کا ہر شہری معاشی اور سماجی انصاف بالادست اور برسرِ اقتدار شخص اور افراد کا گریبان پکڑ کر حاصل کر سکے اور وہ سماجی اور معاشی انصاف کے لیے قانونی اور اخلاقی چارہ جوئی کر سکتا ہو اس لیے کہ جب تک ہم معاشی اور سماجی انساف کی ہر شہری کو فراہمی میں کامیاب نہ ہوں گے نظریہ پاکستان ایک خوش کن نظریے کے سوا کچھ نہ ہوگا اور کسی ایسے شخص کو اس ملک پر حکمرانی کا حق حاصل نہیں جو لوگوں کو سماجی اور معاشی انصاف اور عدل فراہم کرنے میں غفلت برتتا ہو

تیسرے نظریہ پاکستان کا اساسی پہلو یہ ہے کہ ہم خوابوں کی دنیا میں رہنے کی بجائے حقائق کی دنیا میں آئیں اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق ایسے ادارے تشکیل کریں جو پاکستان کو جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ و پیراستہ کر سکیں۔ جدید دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو جو اہمیت و حیثیت حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں صرف جدید ٹیکنالوجی اور سائنسی علوم اپنا کر اور انہیں استعمال میں لا کر ہی ہم موجودہ ترقی یافتہ دنیا کے ہمقدم ہو سکتے ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی پوری نسلِ انسانی کی میراث ہے۔ یہ کسی ایک قوم اور ملک کی ملکیت نہیں بلکہ پوری انسانیت کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے چنانچہ نسلِ انسانی کی میراث میں اپنے اجداد کی طرح ہمیں بھی آج اس ٹیکنالوجی کی پیش رفت میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیئے کیونکہ ٹیکنالوجی کی وجہ سے ہی کل کی اجڈ مغربی اقوام آج کی ترقی یافتہ اقوام بن گئی ہیں مسلمان اگر ٹیکنالوجی پر دسترس حاصل کر لیتے ہیں اور ٹیکنالوجی کے میدان میں مغربی اور اشتراکی دنیا پر سبقت لے جاتے ہیں تو نوعِ انسانی

کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں انہیں اساسی مقام حاصل ہوگا۔ ورنہ ان کے مقدر کا ستارہ ان اقوام کی ٹھوکروں میں بھٹکتا رہے گا جو ٹیکنالوجی کی وجہ سے ترقی کے نصف النہار پر ہیں پاکستان کو ہر پہلو سے ایک مثالی مملکت بنانے اور اسے جدید ترقی یافتہ ریاست کی صورت میں متشکل کرنے کی اسی خواہش کی بناء پر ایسے اساسی خطوط واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو قوموں کا مقدر بدلنے میں اساسی کردار ادا کرتے ہیں۔

ہماری اس تمام تر بحث کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ پاکستان کا قیام محض ہندوؤں کی جارحیت کے نتیجے میں برصغیر کے ایک کونے میں مسلمانوں کے لیے پناہ گاہ ڈھونڈنے کا عمل نہ تھا۔ پاکستان کا قیام ہندوؤں کے معاشی استحصال سے مسلمان جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور عام مسلمانوں کو بچانے پر ہی منحصر نہ تھا۔ بلکہ اصل نقطہ تو یہ ہے کہ ہندو مسلمان کو معاشی طور پر پست رکھنے کی کوشش کیوں کرتا تھا۔ جب کہ دونوں ایک ہی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے اور مسلمانوں کی اکثریت بھی نسلی طور پر ہندوؤں سے قریب تھی ہندوؤں نے ہمارا معاشی استحصال ہمارے مسلمان ہونے کے ناطے سے ہی کیا تھا۔ ہم اسلام کی وجہ سے ہی ہندوؤں کے معاشی ظلم کا شکار تھے اور وہ معاشی طور پر ہمیں کچل کر اپنے اندر جذب کرنا چاہتے تھے۔ اب ہندو اگر ہمیں مسلمان ہونے کی بناء پر سزا دے رہے تھے تو ضرورت اس امر کی تھی کہ ہم اپنے اسلامی تشخص کو بچاتے۔ اس کو عملی طور پر قائم کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ ہم ہندوؤں کا ہر سطح پر مقابلہ کرتے پھر سوال محض ہندوؤں کے معاشی استحصال سے بچنے کا نہ تھا۔ بلکہ اسلام کے نظام معیشت پر مبنی ایک ایسا معاشی نظام قائم کرنا تھا جو سرمایہ داریت اور اشتراکیت سے علیحدہ طور پر اپنا تشخص قائم کرے۔

تصوّرِ پاکستان

مکاتیب اقبال و جناح کی روشنی میں

علامہ اقبال ایسی نابغۂ روزگار شخصیت تھے جس کی مسلمانوں کے عہدِ انحطاط میں دوسری مثال نہیں ملتی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ایک ایسی ملت کو اس کے تشخص کا احساس دلانا تھا جو صدیوں سے اپنوں کے چرکوں اور غیروں کی ریشہ دوانیوں کے ہاتھوں پراگندہ ہو چکی تھی وہ جس ملت کے رکن تھے وہ ایک درخشندہ و رخشندہ ماضی کی وارث تھی۔ اس کی عظمت کے نقوش عربستان کی چھاتی پر ہی پیوست نہ تھے۔ یورپ کے میدانوں میں بھی اس کی اذانوں کی گونج سنائی دے رہی تھی جبل الطارق پر بھی اس کے سجدہ ہائے نیم شبی کے نشان ثبت تھے ایک طرف ان کے نعرۂ تکبیر کی مستی سے افریقہ کے لق و دق صحراؤں میں بگولے رقص کناں تھے تو دوسری طرف وہ بحرِ ہند کے نیلے پانیوں کو چیرتے ہوئے جزائر انڈونیشیا اور ملائیشیا تک میں اپنی داستانیں چھوڑ آئے تھے۔ میر عربؐ کو دامن ہمالہ کی ٹھنڈی ہوا ان کی عظمت کے ان پاسبانوں اور علمبرداروں سے آئی جو اس کفرستان میں ان کے زمزمے گاتے تھے یہ عظیم ملت جو صدیوں تک انسانیت کی فکری، سیاسی، معاشی اور ثقافتی اُمور میں امام رہی تھی اور جس نے قیصر و کسریٰ کی تہذیبوں کو اپنے پاؤں کی ایک ہی ٹھوکر سے ملیامیٹ کر کے دنیا کو نئی تہذیبی اور معاشرتی اقدار دی تھیں ایک ایسے ہولناک انجام سے دو چار ہوئی کہ خود اس کے مِلّی وجود کو سخت دھچکا لگا مسلمان انتشار کا شکار ہو کر خود اپنا مِلّی تشخص کھو بیٹھے دوسرے ان کے ذہنوں پر جمود کی ایک ایسی پھپھوند جم کر رہ گئی جس نے مسلمانوں میں ہر قسم کی فکری، تہذیبی، معاشی اور معاشرتی اقدار کے سوتے خشک کر دیئے تیسرے ان پر یہ افتاد پڑی کہ ان کی درسگاہوں سے فیض یاب ہونے والی دیگر اقوام نے خود کو سنبھالنا شروع کیا اور روشنی کی کرنیں تاریک براعظم یورپ کو منور کرنے لگیں جس کے

طفیل وہاں توہم پرستی، آبا پرستی اور جہالتوں کے اندھیرے چھٹنے لگے اور وہ اقوام زینہ بہ زینہ بلند ہوکر ترقی کی معراج کو چھونے لگیں جس وقت مسلمان خود افتراق و انتشار میں مبتلا ہو رہے تھے، یورپ کی اقوام خود کو متحد کر رہی تھیں بالآخر اسی یورپ نے مسلمانوں پر شب خون مارا اور مسلمانوں کی مست خرامی سے فائدہ اٹھا کر انہیں سیاسی غلامی کی زنجیریں پہنا دیں جو بعد میں تہذیبی، تمدنی، معاشی اور فکری غلامی میں بدلتی چلی گئیں۔

علامہ اقبال جس عہد میں ملّی افق پر ابھرے۔ مسلمانوں کا آفتاب اقتدار ڈوب چکا تھا جدید اسلحہ اور جدید علوم سے لیس یورپ نے پورے عالم اسلام کو اپنے پنجۂ استبداد میں جکڑ لیا تھا۔ مسلمان نہ صرف سیاسی طور پر ہی محکومی کا شکار تھے بلکہ ان کی منجمد معاشرتی اور ثقافتی زندگی بھی یورپی استعماریت کے شکنجے میں پھنس کر رہ گئی تھی مغلوبیت کے احساس کے باعث ان کی زندگیاں شکست خوردگی کا المیہ بن کر رہ گئی تھیں۔ کہیں کہیں مسلمانوں نے اپنے وجود کو بچانے کی کوششیں کیں مگر یہ چنگیاں ان کے تنِ مردہ میں زندگی کی حرارت پیدا نہ کر سکیں مسلمان اپنے پُرشکوہ ماضی کو قصرِ پارینہ سمجھنے لگے بلکہ اس کی صحت پر شک کرنے لگے خصوصاً مغربی مصنفین نے مسلمانوں کے ماضی کو جس طرح مسخ کر کے پیش کیا۔ اس سے انہیں اپنے ماضی سے گھن آنے لگی حال کی ناگفتہ بہ حالت تو ان کے سامنے تھی ہی، چنانچہ مستقبل کے بارے میں بھی ان کا ذہن الجھ کر رہ گیا اور وہ اس احساس میں مبتلا ہو گئے کہ وہ ایک ایسی ملت کے فرد ہیں جس کا نہ کوئی ماضی ہے نہ حال اور نہ کوئی مستقبل یہ وہ صورت حال تھی جس سے ملت کو باہر نکالنے کے لیے علامہ اقبال نے پیش قدمی کی۔

علامہ اقبال کے مکاتیب بنام جناح، کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ایک ایسی دردمند شخصیت سے آگاہی حاصل ہوتی ہے جو مسلمانوں کے قدیم علوم و حالات سے ہی کما حقہ آگاہ نہ تھی بلکہ جدید یورپی علوم میں بھی پوری دسترس رکھتی تھی ان کی حکیمانہ بصیرت سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی کہ مسلمانوں کو دوبارہ قوموں کی امامت کا اہل بنانے کے لیے سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس مرض کی نشاندہی کی جائے جو ملتِ اسلامیہ کو گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے انہوں نے نہ صرف اس مرض کا سراغ لگایا بلکہ اس کا علاج بھی تجویز کیا وہ مرض یہ تھا کہ مسلمان اپنا ملّی تشخص کھو بیٹھے تھے خلافت کے بعد جب ملوکیت برسرِ اقتدار آئی تو وہ تحریک دم توڑ گئی جو داعیِ حق نے شروع کی تھی

اموی اور عباسی ملوکیت کا سنہرا عہد دراصل باقیاتِ خلافت کے سوا کچھ نہ تھا اس دَور میں مسلمانوں میں وہ حریت باقی نہ رہی تھی جس کے طفیل وہ پوری دنیا سے ٹکرا گئے تھے اور ملوکیت کے عہد میں بھی اغیار کی صفوں کو چیر کر آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے تھے اس دَور میں مسلمانوں کا ہاتھ شمشیر و سناں سے ہٹ کر طاؤس و رباب تک آ پہنچا۔ ہندوستان میں تو مسلمانوں کی حکومت کا آغاز ہی ملوکیت سے ہوا تھا یہاں اسلام اپنی اشاعت کے لیے محض صوفیاء اور اولیاء کی انفرادی کوششوں کا رہین منت تھا لہٰذا جونہی مسلمان حکمرانوں کی گرفت ڈھیلی پڑی۔ مسلمانوں کے اقتدار کا سورج ڈوب گیا

مسلم دنیا میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کی فکری تحریکیں

اس صورت حال سے نپٹنے کے لیے پورے عالم اسلام میں زبردست جدوجہد ہوئی۔ تحریک وہابیت جس کے سربراہ اور موئد محمد بن عبدالوہاب نجدی تھے غالباً پہلی چنگاری ہے جو اس امتِ مرحومہ کی خاکستر سے چمکی۔ گرچہ اس کا رجحان قدامت پسندی کی طرف زیادہ تھا مگر اس نے اجتہاد کی طرف بھی خصوصی طور پر زور دیا اور بدعات سے نفرت اور اسلام کے تصورِ توحید اور تعلیماتِ قرآن و سنت پر مسلمانوں کی زندگیوں کی استواری پر اصرار کیا اس کی معاصر تحریک برِصغیر پاک و ہند میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تھی۔ اس تحریک نے ایک طرف تو جہاد کو اپنایا تو دوسری طرف اجتہاد کو بھی اس نے اپنی توجہ کا محور و مرکز بنایا اور ہندوستان میں مرہٹوں کا سر کچلنے کی طرف توجہ مبذول کی اور اس کے لیے احمد شاہ ابدالی سے مدد لی۔ اس کے بعد علمی میدان میں یا دوسرے الفاظ میں اجتہاد میں شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین نے کام کیا اور جہاد پر توجہ شاہ عبدالحی، شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد بریلوی نے دی۔ شمالی افریقہ میں محمد علی سنوسی کی تحریک، ترکی میں سیاسی اور فوجی سطح پر کمال اتاترک اور علمی سطح پر ضیاء گوکلپ وغیرہ کی تحریک جمال الدین افغانیؒ کی پان اسلام ازم کی تحریک اور محمد عبدہ، مفتی اعظم مصر کی کوشش اسی ضمن میں تھیں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد سرسیدؒ نے مسلمانوں کے قومی وجود کو ایک محتاط ملی رہنما کے روپ میں قائم رکھنے کی کوشش کی مگر یہ تمام کوششیں ایک خاص نہج پر اثرات مرتب کرنے کے سوا کچھ زیادہ بارآور ثابت نہ ہوئیں۔

علامہ اقبال نے مسلمانوں کو ملی اور انفرادی دونوں حیثیتوں سے اپنا مقام ملی پہچاننے کی تلقین کی۔

انہیں بتایا کہ وہ کس گردوں کے ٹوٹے ہوئے ستارے ہیں۔ علم کے موتی کیا قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ خودی میں شاہی ہے اور خودی سے محرومی ہمیشہ کی روسیاہی ہے خودی سے مراد علامہ کا شعور ذات کے سوا کچھ نہ تھا کہ انسان خود کو اپنی ذات کے شعور میں دیکھے کہ وہ کیا ہے ؟ اس کا اس کائنات میں کیا مقام ہے ؟ اس کو تین سوالوں کا جواب جاننا چاہیئے کہ وہ کیا ہے ؟ اس کا اس کائنات میں کیا مقام ہے اور اس کائنات میں اس کی ذمہ داریاں کیا ہے ؟ اس کے بعد دوسرا سوال یہ کہ وہ خود کو سماج کے اور تاریخ کے شعور میں دیکھے کہ جس سماج میں وہ ہے اس میں مقام کیا ہے سماج پر اس کے حقوق کیا ہیں اور سماج کے اس پر کیا حقوق ہیں ؟ اسی طرح تاریخ کے وسیع منظر میں اس کا مقام کیا ہے ؟ اس کو اقبال جاوید نامہ میں "خود را دیدن بنور دیگرے" کہتے ہیں اور پہلے کو اقبال "خود را دیدن بنور خویشتن" کے نام سے یاد کرتے ہیں اس کے بعد اقبال فرد اور سماج دونوں کے لیے لازم قرار دیتا ہے کہ وہ "خود را دیدن بنور ذاتِ حق" کے مرحلہ سے بھی گزریں اور دیکھیں کہ ذاتِ حق کے جو اس پر حقوق ہیں کیا اس نے بہ حسن و خوبی ادا کر دیئے ہیں ؟ اس کو اقبالؒ یوں پیرایۂ شعر میں ادا کرتا ہے

گفت : موجود آنکہ می خواہد نمود — آشکارائی تقاضائی وجود !

زندگی خود را بخویش آراستن — بر وجود خود شہادت خواستن

زندہ یا مردہ یا جان بلب ؟ — از سہ شاہد کن شہادت را طلب

شاہد اوّل : شعور خویشتن — خویش را دیدن بنور خویشتن

شاہد ثانی شعور دیگری — خویش را دیدن بنور دیگری

شاہد ثالث شعور ذات حق — خویش را دیدن بنور ذات حق[1]

اس سوال کا جواب علامہ اقبال نے مسلمانوں کو یہ دیا کہ ایک تو وہ مسلمان ہیں اور انہیں دنیا میں مسلمان کی حیثیت سے ہی اپنا تشخص قائم کرنا ہے کیونکہ کوئی ملت بھی اپنی روائیت اور اپنے ماضی سے کٹ کر اپنا تشخص قائم نہیں رکھ سکتی۔ دوسرے مرحلے پر اقبال نے کہا کہ "خود را دیدن بنور دیگری" کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اپنے پُر افتخار ماضی کی طرف متوجہ ہوں انہوں نے یوں مسلمانوں کو ان کے

---

[1] جاوید نامہ، ص ۱۳ - ۱۴

ماضی سے کٹنے نہیں دیا اور اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کو جہاد اور اجتہاد کے ذریعے عصرِ نو کے جدید رجحانات اور علمی، فکری، سائنسی، معاشی، عمرانی اور اخلاقی حاصلات کی روشنی میں اپنی فکر کی تجدید کی طرف متوجہ کیا۔ تاکہ مسلمان اقوام عالم میں اپنا تشخص درست طور پر قائم کر سکیں اور امامتِ اقوام کے منصب کو ادا کر سکیں، فرد اور جماعت دونوں لحاظ سے ذاتِ حق کے سامنے سرخرو ہوں اور جب خود کو اس ذات کے شعور میں دیکھیں تو انہیں کوئی شرمندگی نہ ہو

خطوطِ اقبال و جناح اور ملّی تشخص کی تلاش

علامہ اقبالؒ کے خطوط جب ہم قائداعظمؒ محمد علی جناح کے نام پڑھتے ہیں تو یہ حقیقت اظہر من الشمس ہوتی ہے کہ علامہ اقبالؒ مسلمانوں کے ملی تشخص کے لیے اور مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی بازیافت کے سلسلے میں مسلم دنیا کی تنظیمِ نو چاہتے تھے۔

علامہ اقبال کو اس بات سے بڑا قلق ہوتا تھا کہ مسلمانوں کا ایک گروہ اس قدر جاہل ہے، کہ وہ عہدِ جدید کی ان چیزوں کو قبول کرنے میں بھی انقباض محسوس کرتا ہے جو عین حکمتِ اسلام ہیں دوسرا گروہ یورپ کی اندھا دھند نقالی میں اپنی تہذیبی اقدار سے منہ موڑ رہا ہے۔ تیسرا گروہ جو جدید علوم سے لیس اور قومی حمیت سے سرشار ہے وہ مغربی امپریلزم سے بغاوت کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی فاسد کوکھ سے جنم لینے والے فلسفۂ اشتراکیت کی فسوں کاری سے متاثر ہو رہا ہے انہوں نے ایک طرف تو مغربی سرمایہ داریت کو بے نقاب کیا تو دوسری طرف اشتراکیت کے مکروہ چہرہ سے بھی نقاب اٹھائی اور بتایا کہ طریق کوہ کن میں پرویزی حیلے مخفی ہیں۔

پاکستان ناگزیر کیوں؟

نظریہ پاکستان کا ثقافتی اور تہذیبی پہلو

علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کے ملّی تشخص کے لیے ضروری قرار دیا کہ وہ اپنی سیاسی آزادی اور جغرافیائی سرحدوں کا تحفظ کریں اور متحدہ صورت میں دنیا میں اپنا کردار ادا کریں۔ انہیں کامل یقین تھا کہ جب تک مسلمان سیاسی غلامی کی زنجیریں نہیں کاٹ لیتے اس وقت تک وہ تہذیبی، معاشی اور فکری غلامی سے نجات نہیں پا سکتے۔ انہوں نے مسلمانوں کے عالمی سطح پر اتحاد کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے

ہندوستان کی سیاست میں اپنا کردار ادا کرنا شروع کیا انہوں نے قائداعظم محمد علی جناح کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا۔

"مجھے یقین ہے کہ آپ اس حقیقت سے آگاہ ہوں گے کہ دستور جدید نے کم از کم ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اس امر کا ایک نادر موقع فراہم کیا ہے کہ ہندوستان اور مسلم ایشیا میں آئندہ سیاسی ترقیوں کے پیشِ نظر ہندوستان کے مسلمان اپنی تنظیم کرلیں۔" [1]

اسی مکتوب میں علامہ اقبال نے لکھا ہے کہ

"ہمیں یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ ایشیا میں اخلاقی اور سیاسی قوت کی صورت میں اسلام کا مستقبل زیادہ تر ہندوستانی مسلمانوں کی مکمل تنظیم پر منحصر ہے۔" [2]

کیونکہ یہی ایک عملی صورت تھی جس سے علامہ اقبالؒ ہندوستانی مسلمانوں کی تنظیم کے توسط سے عالم اسلام کی سربلندی کا خواب پورا کرنے میں کوئی اہم کردار ادا کر سکتے تھے ہندوستان کی آزادی کے ضمن میں ان کی نکتہ سنج اور دُور رس نگاہوں سے یہ بات پوشیدہ نہ تھی کہ ہندوستان جلد یا بدیر آزاد ہوکر رہے گا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہندوستان کی آزادی کا مطلب نئے دَور میں صرف ہندوؤں کی آزادی ہوگا۔ کیونکہ عہدِ جدید میں جمہوریت جس تیزی سے آرہی تھی اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مسلمان ایک کی غلامی سے نکل کر دوسرے کی غلامی میں چلے جائیں گے۔ ہندوؤں کے رویّے کا تجزیہ کرتے ہوئے ۱۱ر جون ۱۹۳۷ء کے مکتوب میں لکھا کہ

"گزشتہ تین ماہ کی مدت میں تین فرقہ وارانہ فساد اور سکھوں اور ہندوؤں کی طرف سے رسولِ کریمؐ کی شان میں گستاخی کی کم و بیش چار وارداتیں وقوع پذیر ہوئیں میں نے صورت حال کا غائر مطالعہ کیا ہے اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان واقعات کے وجوہ نہ تو مذہبی

۱۔ اقبال کے خطوط جناح کے نام (مرتبہ عبدالرحمٰن سعید، ناشر سید عبدالرزاق تاجر کتب، حیدر آباد دکن) مکتوب ۳۰ر مارچ ۱۹۳۷ء، ص ۱۳۔

۲۔ ایضاً

ہیں اور نہ اقتصادی بلکہ ان کی خالص سیاسی بنیاد ہے یعنی اس سے پتہ چلتا ہے کہ سکھ اور ہندو مسلم اکثریت ہی کے صوبوں میں مسلمانوں کی تخولیف پر آمادہ ہیں۔"[1]

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ہندوؤں کی جماعتیں کیا کردار رکھتی ہیں اور وہ اپنی تنظیم کن مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر کر رہی ہیں اور مسلمانوں کے بارے میں ان کا رویہ کیا ہے۔ علامہ لکھتے ہیں

" صدر کانگریس نے مسلمانوں کے سیاسی وجود سے صریحاً انکار کر دیا ہے ہندوؤں کا دوسرا ادارہ یعنی ہندو مہاسبھا نے جس کو میں ہندو عوام کی حقیقی نمائندہ تنظیم سمجھتا ہوں۔ ایک سے زائد مرتبہ اعلان کیا ہے کہ ہندو مسلم متحدہ قومیت کا قیام ناممکن ہے ان حالات کے تحت یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں قیامِ امن میں واحد راہ یہی ہے کہ نسلی، مذہبی اور لسانی مماثلت کے لحاظ سے اس کی دوبارہ تقسیم عمل میں آئے "[2]

کانگریس اور ہندوؤں کی دوسری جماعتوں کے کردار کے علاوہ بھی مسلمانوں کے ساتھ جو ہندوؤں کا سلوک تھا۔ اس کی کئی نادر مثالیں تاریخ کے صفحات پر رقم ہیں ہندو نہ صرف مسلمانوں سے سیاسی طور پر ہی نفرت کا اظہار کرتے تھے بلکہ اس سے بڑھ کر وہ عمرانی سطح پر بھی مسلمانوں کا مناطعہ کئے ہوئے تھے

ہندوؤں کے نزدیک؛

" مسلمان ملیچھ (ناپاک) تھا اور ہندوؤں کی سب سے زیادہ پست ذات شودروں کے برابر تھا۔ اس کے مَس ہونے کے بعد ہندوؤں پر غسل واجب ہو جاتا تھا۔ ریلوے اسٹیشنوں پر مسلمان اور ہندو پانی بکتا تھا۔ مسلمان ہندو پانی پی لیتا تھا۔ مگر ہندو مسلمان پانی پی لے تو اپنے دھرم سے ہاتھ دھو بیٹھتا تھا۔ ہندو گائے کو پوجتا تھا اور مسلمان اس کا گوشت کھاتا تھا۔"[3]

(۱) ۱۱ر جون ۱۹۳۷ء

(۲) ایضاً

(۳) اعظمی، فہیم۔ پاکستان میں قوم اور قومیتوں کا مسئلہ، الحمرا اکیڈمی لاہور۔

ایسی فضا میں جہاں ہندو اور مسلمان عمرانی طور پر کٹے ہوئے تھے اور ہندو مسلمانوں سے نفرت رکھتے تھے اور ہزار سالہ غلامی کا بدلہ لینے پر تلے ہوئے تھے اتحاد کا سوال کیوں کر پیدا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ہر ہندو لیڈر رام راج کے خواب دیکھ رہا تھا اور مسلمان انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے لالہ ہر دیال نے اپنے ایک مضمون میں ہندوؤں کو بتایا کہ

"ہندو سنگھٹن (اتحاد) کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں ایک متحد، مضبوط اور گرد و پیش سے باخبر، فعال سیاسی جماعت تشکیل دی جائے اور ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کو حل کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو شدھی کے ذریعے (پاک کر کے) ہندو دھرم میں شامل کر لیا جائے۔" [1]

ہندوؤں کے اس رویہ کو پیشِ نظر رکھیں تو معلوم ہو گا کہ دورِ جدید نے جس جمہوری مزاج کو جنم دیا تھا، اس کی وجہ سے اقتدار مسلم اقلیت کی بجائے ہندو اکثریت کو ملنا تھا چنانچہ مسلمانوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ وہ اپنے نظریے، اپنے کلچر، اپنے تمدن اور اپنے قومی تشخص کو قائم رکھنے کے لیے کیا اقدام کریں۔ مسلم زعماء کی ہندو مسلم اتحاد کی ہر کوشش اکارت گئی تھی چنانچہ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ مسلمان خود کو ہندوؤں سے الگ کر کے اپنے نظریہ اور اپنی ثقافت کی اس سرزمین سے پیوستگی کریں جس میں وہ اکثریتی حیثیت سے قبل ازیں موجود ہیں قائداعظم محمد علی جناح نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اس اختلاف اور اس اختلاف سے جنم لینے والے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔

"حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے "قومی تصور" اور ہندو دھرم کے سماجی طور طریقوں کے باہمی اختلاف کو محض وہم و گمان بتانا ہندوستان کی تاریخ کو جھٹلانا ہے ایک ہزار سال سے ہندوؤں کی تہذیب اور مسلمانوں کی تہذیب ایک دوسری سے دو چار ہیں اور دونوں قومیں آپس میں میل جول رکھتی چلی آئی ہیں مگر ان کے اختلافات اسی پرانی شدت سے موجود ہیں۔ ان کے متعلق یہ توقع رکھنا کہ ان میں

(۱) ہر دیال لالہ، اخبار تیج، کرشن نمبر ۱۹۲۴ء ص ۱۵۔

محض اس وجہ سے انقلاب آجائے گا اور ہندو اور مسلمان ایک قوم واحد بن جائیں گے کہ ان پر ایک جمہوری آئین کا دباؤ ڈالا گیا۔ سراسر غلطی ہے، جب ہندوستان میں ڈیڑھ سو سال سے قائم شدہ برطانوی وجدانی حکومت اس کام میں کامیاب نہ ہوسکی تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت میں فیڈرل نظام کے جبری قیام سے وہ کامیابی حاصل ہو جائے گی ہندوستان کا سیاسی مسئلہ فرقوں سے متعلق نہیں، بلکہ قوموں سے متعلق ہے بلاشبہ اسے ایک بین الاقوامی مسئلہ قرار دینا چاہیئے اور اسی نقطۂ نظر سے اس کا حل تلاش کرنا لازم ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اس بنیادی امر واقعہ کی صحت تسلیم کریں۔ جب تک ہم اسے درست نہ مانیں گے، ہمارا وضع کردہ آئین ناکام رہے گا اور تباہی لائے گا"۔[1]

بے جوڑ اتحاد کا نتیجہ کیا نکلے گا جب کہ دونوں اقوام کے نظریات اور نظامات میں واضح طور پر تفاوت موجود تھا ؟ چنانچہ ان کے درمیان اتحاد کو ایک واہمہ سے زیادہ کچھ اہمیت حاصل نہیں۔

" اسلام اور ہندو دھرم محض مذہب نہیں ہیں بلکہ درحقیقت وہ دو مختلف معاشرتی نظام ہیں۔ چنانچہ اس خواہش کو خواب و خیال ہی کہنا چاہیئے کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک مشترکہ قومیت تخلیق کرسکیں گے۔ یہ لوگ آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتے نہ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں۔ میں واشگاف لفظوں میں کہتا ہوں کہ وہ دو مختلف تہذیبوں سے واسطہ رکھتے ہیں اور ان تہذیبوں کی بنیاد ایسے تصورات اور حقائق پر رکھی گئی ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں بلکہ اکثر متصادم ہوتے رہتے ہیں۔ انسانی زندگی کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیالات اور تصورات ایک دوسرے سے مختلف ہیں یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی ترقی کی تمناؤں کے لیے مختلف تاریخوں سے نسبت رکھتے ہیں۔ ان کے تاریخی وسائل اور ماخذ مختلف

---

(۱) قائداعظم، اجلاس مسلم لیگ، ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء، لاہور

ہیں۔ ان کی رزمیہ تنظیمیں یا ان کے سربرآوردہ بزرگ اور قابل فخر تاریخی کارنامے سب مختلف اور الگ الگ ہیں۔ اکثر اوقات ایک قوم کا زعیم اور راہنما دوسری قوم کے بزرگ اور برتر ہستیوں کا دشمن ثابت ہوتا ہے، ایک قوم کی فتح، دوسری قوم کی شکست ہوتی ہے۔ ایسی دو قوموں کو ایک ریاست اور ایک حکومت کی ایک مشترکہ گاڑی کے دو بیل بنانے اور ان کو باہمی تعاون کے ساتھ قدم بڑھانے پر آمادہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ دونوں کے دلوں میں بے صبری روز بروز بڑھتی رہے گی جو انجام کار تباہی لائے گی۔ خاص کر اس صورت میں کہ ان میں سے ایک قوم تعداد کے لحاظ سے اقلیت میں ہو اور دوسری کو اکثریت حاصل ہو۔ ایسی ریاست کے آئین کا عمل خاک میں مل کر رہے گا"۔[۲]

ان حالات میں ہندوستان کی تقسیم لازمی تھی تاکہ مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے منتقمانہ ردِ عمل سے محفوظ رکھا جا سکے، تاکہ معاشی طور پر ہندو بنیوں کے پنجہ میں جکڑے ہوئے مسلمان اپنے قومی تشخص کو کھو کر ان میں ضم ہو کر نہ رہ جائیں۔ ایسے میں علامہ اقبال نے جب ہندوستان کی جغرافیائی اور سیاسی صورتِ حال کا جائزہ لیا تو انہیں برصغیر کے شمال مغرب میں کشمیر، سرحد، پنجاب، سندھ اور بلوچستان پر مبنی ایک ایسی پٹی نظر آئی جو مسلمان اکثریت کے علاقوں پر مشتمل تھی اور جس کے ذرائع و وسائل بھی ایسے تھے کہ وہ ہندوستان سے علیحدہ ہو کر بھی زندہ رہ سکتی تھی۔ پھر یہ پٹی جغرافیائی لحاظ سے بھی ایسے محلِ وقوع پر تھی کہ وہ دیگر مسلم ممالک سے جڑی ہوئی تھی۔ فوجی نقطۂ نظر سے بھی یہ خطے طاقتور تھے۔ علامہ اقبال نے ہندوستان کے مسلمانوں کے قومی تشخص کے لیے ضروری قرار دیا کہ وہ اپنی آزادی اور علیحدگی کی جدوجہد میں سر دھڑ کی بازی لگا دیں۔ کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے وجود کے تحفظ میں ہی اس امر کا یقین پوشیدہ تھا کہ ہندی مسلمان اپنے وجود کے تحفظ کے بعد عالم اسلام کو متحد کر سکے یہ تھا وہ زاویہ نگاہ جس سے انہوں نے مسلمانوں کے لیے برصغیر میں ایک علیحدہ وطن کی ضرورت محسوس کی انہوں نے اپنے ۱۱ جون ۱۹۳۷ء کے مکتوب میں لکھا کہ۔

(۱) قائداعظم، اجلاس مسلم لیگ، ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء، لاہور

" میرے خیال میں واحد وفاقی ہندوستان کا تصور جو دستورِ جدید میں پیش کیا گیا ہے۔ بالکل مایوس کن ہے اور یہ بیان کی ہوئی میری تجاویز کے مطابق مسلم صوبوں کا جداگانہ وفاق ہی وہ واحد صورت ہے جس کے ذریعے ہم پرامن ہندوستان حاصل کر سکتے ہیں اور غیر مسلموں کے تسلط سے مسلمانوں کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔" ۱

علامہ اقبال نے مسلمانوں کے قومی تشخص کے مسئلے کو سب سے زیادہ اہمیت دی کیونکہ یہی وہ اساسِ پاکستان تھی جس پر ہندوستان کے مسلمانوں کی بقاء اور آئندہ ترقی کا دارومدار تھا۔ انہوں نے اس مسئلہ کی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ۲۰ر مارچ ۱۹۳۷ء کو قائداعظم کے نام اپنے مکتوب میں تجویز پیش کی کہ،

" آپ کو چاہیئے کہ دہلی میں آل انڈیا مسلم کنونیشن کا ایک اجلاس فوراً منعقد کریں اور اس میں جدید صوبہ داری مجالس مقننہ کے ارکان اور دوسرے ممتاز مسلم قائدین کو دعوت دیں اس کنونشن میں ممکنہ قوت کے ساتھ ایک ممتاز سیاسی وحدت کی حیثیت سے ہندوستانی مسلمانوں کے نصب العین کو دوبارہ بیان کی جائے ہندوستان کی اندرونی اور بیرونی دنیا پر یہ امر واضح کر دینا نہایت ضروری ہے کہ معاشی مسئلہ ہی ملک کا تنہا مسئلہ نہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے ہندوستان اکثر و بیشتر مسلمانوں کے لیے ثقافتی مسئلہ کی حیثیت سے اہم نتائج کا حامل ہے۔" ۲

اس کے ساتھ ہی ہندوؤں پر مسلمان کے اتحاد کی حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ مسلمان ان کے چکر میں نہیں آسکتے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اس کنونیشن کے انعقاد سے۔

" ہندوؤں پر یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جائیگی کہ کوئی سیاسی تدبیر خواہ کتنی ہی مستحکم کیوں نہ ہو ہندوستانی مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ نہیں کر سکتی کہ وہ اپنی ثقافتی وحدت کو نظر انداز کریں۔" ۳

۱۔ مکتوب ۲۱ر جون ۱۹۳۷ء

۲ مکتوب ۲۰ر مارچ ۱۹۳۷ء

۳ ایضاً

ہندوستانی مسلمانوں کی ثقافتی وحدت کے تحفظ سے ان کی مراد قیامِ پاکستان تھا کیونکہ اس کے بغیر مسلمان کسی بھی قسم کی ترقی تو کجا اپنا وجود تک قائم نہ رکھ سکتے تھے۔

مسلمانانِ برصغیر کے قومی تشخص کو پاکستان کی صورت میں تحفظ دینے کا مطلب یہ تھا کہ ایک طرف تو مسلمان سیاسی آزادی سے ہمکنار ہو کر اپنی تہذیبی اور عمرانی روایات اور اقدار کے مطابق اپنے ملّی کردار کی تشکیل کریں۔ تہذیب و ثقافت اور تمدن و معاشرت میں اپنی انفرادیت اجاگر کریں تاکہ وہ غیروں کی معاشی غلامی سے آزاد ہو کر ایسے خطوط پر اپنی ریاست کی تشکیل کریں جس سے مسلم معاشرے کے پسے ہوئے طبقات بھی اپنی دبی ہوئی اور کچلی ہوئی صلاحیتوں کو پروان چڑھا سکیں۔ علامہ اقبال مسلمانوں کی معاشی خوشحالی کے لیے سرمایہ داریت کو زہرِ ہلاہل تو گردانتے ہی تھے۔ اشتراکیت کو بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے انہوں نے مسلمانوں کے معاشی مسئلہ سے کبھی تغافل نہیں کیا۔ چنانچہ نظریہ پاکستان مسلمانوں کے ثقافتی وجود کی تحریک بھی تھا انہوں نے قائداعظم کی توجہ اس کی طرف اپنے مکتوب میں دلاتے ہوئے کہا کہ

"یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ مسلم لیگ کے دستور اور لائحہ عمل میں تبدیلیوں کی نسبت میں نے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ آپ کے پیشِ نظر ہے مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ جہاں تک مسلم ہندوستان کا تعلق ہے حالات کی نزاکت کا آپ کو کامل احساس ہے مسلم لیگ کو بالآخر یہ طے کرنا ہوگا کہ آیا وہ ہندوستانی مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کا نمائندہ ادارہ کے طور پر باقی رہے گی یا مسلم عوام کا جنہوں نے معقول وجوہ کی بنا پر اب تک اس میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا ہے ایسا سیاسی ادارہ جو متوسط طبقہ کے مسلمانوں کی قسمتوں کو سنوارنے کا ذمہ نہ لے۔ تو میرا شخصی ایقان ہے کہ وہ عوام کے لیے جاذبِ توجہ نہیں ہو سکتا۔"[1]

نظریہ پاکستان معاشی پہلو

دستورِ جدید نے جس طرح کی اقربا پروری، اعزّہ نوازی اور رشوت، سفارش اور عام مسلمانوں

[1] مکتوب ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء

کے استحصال کی جو نوعیت پیدا کی اس کا بھی انہیں احساس تھا فرماتے ہیں۔

"دستور جدید کے تحت بڑے بڑے عہدے اعلیٰ طبقہ کے افراد کو اور چھوٹی چھوٹی ملازمتیں دزراء کے احباب ادر اعزہ کو ملیں گی۔ دوسرے امور میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے عام مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا خیال تک نہیں کیا"۔[1]

مسلمان جس پیچیدہ معاشی صورتِ حال میں گھرے ہوئے تھے، وہ نہایت اندوہناک تھی۔ پنجاب جہاں مسلمان اکثریت میں تھے یہاں بھی وہ سود خور بنیّوں اور ہندو و سکھ جاگیردار، سرمایہ دار اور زمینداروں کے معاشی استحصال کی زد میں تھے۔ تمام بڑی بڑی ملازمتوں پر غیر مسلم مسلط تھے اور مسلمان نہایت بُرے معاشی حالات میں تھے بہت کم مسلمان معاشی طور پر فارغ البال تھے۔ ایسے میں برطانوی حکومت بھی مسلمانوں کی فلاح سے غافل تھی علامہ نے اس صورت حال کی طرف قائداعظم کی توجہ دلائی اور کہا۔

"روٹی کا مسئلہ روز بروز نازک ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمانوں نے محسوس کرنا شروع کیا ہے کہ گزشتہ دو سال سے وہ انحطاط پذیر ہیں۔ ویسے تو انہیں یقین ہے کہ ان کی غربت ہندو اور سرمایہ داری کا نتیجہ ہے مگر یہ ادراک کہ غیر ملکی حکومت بھی اس میں برابر کی شریک ہے ان کے ذہن میں پوری طرح پیدا نہیں ہوا۔ لیکن آئندہ اس خیال کا پیدا ہونا ناگزیر ہے"۔[2]

حضرت قائداعظم کو بھی اس صورت حال کا پورے طور پر احساس تھا۔ آپ نے فرمایا کہ

"مجھے اہلِ دیہات کی غربت اور مفلوک الحالی دیکھ کر بہت رنج ہوتا ہے۔ میں نے سفر کے دوران میں جب ریلوے اسٹیشنوں پر پنجاب کے دیہاتی مسلمانوں کے گروہ دیکھے تو مجھے ان کے افلاس سے سخت دکھ ہوا۔ پاکستان کی حکومت کا سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ ان لوگوں کا معیارِ زندگی بلند کرے اور زندگی بلکہ بہتر زندگی سے شاد کام ہونے کا

---

(۱) مکتوب ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء

(۲) ایضاً

سامان بہم پہنچائے۔" [1]

اس مقصد کے لیے انہوں نے قیامِ پاکستان سے قبل بھی سرمایہ داروں اور زمینداروں کو لتاڑنے میں دریغ نہیں کیا۔

"میں ضروری سمجھتا ہوں کہ زمینداروں اور سرمایہ داروں کو متنبہ کر دوں۔ اس طبقے کی خوشحالی کی قیمت عوام نے ادا کی ہے اس کا سہرا جس نظام کے سر ہے وہ انتہائی ظالمانہ اور شر انگیز ہے۔ اور اس نے اپنے پروردہ عناصر کو اس حد تک خود غرض بنا دیا ہے کہ انہیں دلیل سے قائل نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی مقصد برآری کے لیے عوام کا استحصال کرنے کی خوئے بدان کے خون میں رچ گئی ہے وہ اسلامی احکام کو بھول چکے ہیں حرص و ہوس نے سرمایہ داروں کو اتنا اندھا کر دیا ہے کہ وہ جلب منفعت کی خاطر دشمن کا آلۂ کار بن جاتے ہیں یہ سچ ہے کہ آج ہم اقتدار کی گدی پر متمکن نہیں۔ آپ شہر سے باہر کی طرف چلے جایئے میں نے دیہات میں جا کر خود دیکھا ہے کہ ہمارے عوام میں لاکھوں افراد ایسے ہیں جنہیں دن میں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا کیا آپ اسے تہذیب اور ترقی کہیں گے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے؟ کیا آپ نے سوچا کہ کروڑوں لوگوں کا استحصال کیا گیا ہے اور اب ان کے لیے دن میں ایک بار کھانا حاصل کرنا بھی ممکن نہیں رہا۔ اگر پاکستان کا حصول اس صورت حال میں تبدیلی نہیں لا سکتا تو پھر اسے حاصل نہ کرنا ہی بہتر سمجھتا ہوں۔ اگر وہ (سرمایہ دار اور زمیندار) عقل مند ہیں۔ تو وہ نئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیں گے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو پھر خدا ان کے حال پر رحم کرے۔ ہم ان کی کوئی مدد نہ کریں گے۔" [2]

بعض ضروری صنعتوں کو قائداعظم قومی تحویل میں لینے کے قائل تھے۔ ان کا مقصد نجی سرمایہ کاری

۱۔ اجلاس مسلم لیگ، لائل پور، ۱۸ نومبر ۱۹۴۲ء

۲۔ اجلاس مسلم لیگ، دہلی، ۲۴ مارچ ۱۹۴۳ء

کو کچلنا نہیں تھا بلکہ عوام کی ضروریات کے پیشِ نظر اقتصادی ڈھانچہ میں اہم اور دورس تبدیلیاں کرنا تھا

"میرا ایمان ہے کہ پاکستان بننے پر موجودہ دور میں ضروری اور بنیادی نوعیت کی صنعتوں کو سرکاری تحویل میں لینا ہوگا اور یہی عمل عوامی ضروریات کے تحت بعض دوسرے شعبوں میں کرنا ہوگا۔"[1]

اشتراکیت سے اقبال اور قائداعظم کی بیزاری

لیکن اشتراکیت کی طرف نہ تو علامہ اقبال مائل تھے نہ قائداعظم البتہ سوشلزم نے جس اقتصادی منصوبہ بندی کو رائج کیا تھا اور قومیانے کی طرف جس رجحان کو ظاہر کیا تھا اور سرمایہ داری نظام کی جن قباحتوں کو بے نقاب کرکے عام آدمی کی حالت سدھارنے کی طرف جو توجہ کی تھی علامہ اقبال اور قائداعظم اس سے استفادہ کرنے کے قائل تھے۔ چنانچہ قائدِ اعظم فرماتے ہیں۔

"مغرب کے معاشی نظام نے انسانیت کے لیے لاینحل مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ اکثر لوگوں کی یہ رائے ہے کہ مغرب کو اس تباہی سے جو ساری دنیا کے سر پر مغرب ہی کی وجہ سے منڈلا رہی ہے کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے۔ مغربی معاشی نظام انسانوں کے مابین انصاف کرنے اور بین الاقوامی میدان میں آویزش اور چپقلش دور کرنے میں ناکام رہا ہے بلکہ گزشتہ نصف صدی میں بپا ہونے والی دو عظیم جنگوں کی ذمہ داری سراسر مغرب پر عائد ہوتی ہے مغربی دنیا، صنعتی قابلیت اور مشینوں کی دولت کے زبردست فوائد رکھنے کے باوجود انسانی تاریخ کے بدترین باطنی بحران میں مبتلا ہے اگر ہم نے مغرب کا معاشی تصور اور نظام اختیار کیا تو عوام کی پرسکون خوشحالی حاصل کرنے کے لیے اپنے نصب العین میں ہمیں کوئی مدد نہ ملے گی ..... ہمیں اپنی تقدیر اپنے منفرد اور مخصوص انداز میں بنانی پڑے گی اور دنیا کے سامنے ایک ایسا مثالی نظام پیش کرنا پڑے گا۔ جو انسانی مساوات اور معاشرتی انصاف کے

---

[1] ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کو انٹرویو، ۸ نومبر ۱۹۴۵ء

سچے اسلامی تصورات پر قائم ہو۔ ایسا نظام پیش کر کے گویا ہم مسلمان کی حیثیت سے اپنا فرض انجام دیں گے۔ انسانیت کو سچے اور صحیح امن کا پیغام دیں گے کہ صرف ایسا امن ہی انسانیت کی خوشی اور خوشحالی کا امین و محافظ ہو سکتا ہے " ۱

اشتراکیت کے بارے میں ان کی رائے تھی:

" اشتراکیت، بالشویت یا اسی قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسلک درحقیقت اسلام اور اس کے نظام سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط اور تناسب نہیں پایا جاتا " ۲

علامہ اقبال برصغیر میں اشتراکیت کے نفوذ کے بارے میں اپنے مکاتیب میں لکھتے ہیں۔

" ہندو سیاست میں جواہر لعل نہرو کی اشتراکیت کا شمول بھی شائد خود ہندوؤں میں خون ریزی کا موجب ثابت ہو۔ اشتراکی جمہوریت اور برہمنیت کے مابین جو امر تنقیح طلب ہے وہ اس امر سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے جو کبھی برہمنیت اور بدھ مت کے درمیان پیدا ہو گیا تھا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ ہندوستان میں اشتراکیت کا وہی انجام ہو گا جو بدھ مت کا ہوا تھا۔ لیکن اتنا تو بالکل واضح ہے کہ اگر ہندو مت نے اشتراکی جمہوریت قبول کر لی تو پھر ہندو مت باقی نہیں رہے گا۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اگر وہ اشتراکی جمہوریت کو اپنے قانونی اصول کے مطابق اشتراکیت کی بعض موزوں و مناسب شکلوں کو قبول کرے تو کوئی انقلاب نہیں بلکہ اصل اور خالص اسلام کی طرف رجوع کرنے کے مترادف ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ جدید مسائل کا حل ہندوؤں کے معاملہ میں مسلمانوں کے لیے آسان تر ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے اوپر ظاہر کیا ہے مسلم ہندوستان کے لیے ان مسائل کے حل کو ممکن بنانے کی خاطر ملک کی دوبارہ تقسیم کے ذریعہ بڑی مسلم اکثریت کے واسطے ایک یا زیادہ مسلم مملکتوں کی فراہمی ضروری ہے۔ کیا آپ

---

۱ ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء میں چٹاگانگ میں تقریر

۲ تقریر ۱۹۴۱ء حیدرآباد دکن۔

نہیں سمجھتے کہ اس قسم کے مطالبہ کا وقت آگیا ہے۔ جواہر لال کی ملحدانہ اشتراکیت کا شاندیہی بہترین جواب ہے جو آپ دے سکتے ہیں۔"[1]

اس لیے کہ

"جواہر لال کی ملحدانہ اشتراکیت کی طرف مسلمانوں کے مائل ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔"[2]

اسلام معاشی مسئلہ حل کرتا ہے

مگر جب مسلمانوں کے ملحدانہ اشتراکیت کی طرف مائل ہونے کا رجحان نہیں تو پھر مسلمانوں کے معاشی مسئلہ کے حل کی کیا صورت ہو؟ علامہ اقبال نے اپنے خطوط میں اس نازک مسئلہ پر بھی روشنی ڈالی اور پاکستان کے نظریہ میں مسلمانوں کے معاشی مسئلہ کو حل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ آپ فرماتے ہیں۔

"اب سوال صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کی غربت کے مسئلہ کا حل کیسے ممکن ہے لیگ کے سارے مستقبل کا دارومدار ان مساعی پر ہے جو اس مسئلہ کو حل کرنے میں وہ اختیار کرے گی۔ اگر لیگ اس قسم کی کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتی تو یقین ہے کہ مسلم عوام پہلے کی طرح اس سے بے تعلق رہیں گے۔"[3]

اپنے خطوط میں علامہ اقبال نے نظریہ پاکستان کا خرک ایک تو ایشیا میں ہونے والی تبدیلیوں کو قرار دیا جن کے تحت اس برِاعظم میں جمہوریت اور قوموں کا حق خود ارادیت آرہا ہے۔ اقبال نے برصغیر کی ہندو اور مسلم دونوں قوموں کو یہ حق دینا پسند کیا کہ خود اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کے قومی اور ثقافتی تشخص اور تحفظ کے لیے ایک علیحدہ مملکت کے قیام کو ازبس ضروری قرار دیا دوسرے انہوں نے اسلام کے نظریہ اور اصول کی روشنی میں دورِ جدید میں ایک اسلامی ریاست کے قیام کو اپنے

---

[1] ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء

[2] مکتوب اقبال۔ ایضاً

[3] مکتوب، ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء

تصورِ پاکستان کا محرک بنایا۔ علامہ اقبال ایک ایسی ریاست چاہتے تھے جہاں مسلمان اپنے دین اپنے فلسفۂ حیات کے مطابق ایک نظامِ زندگی رائج کریں۔ اس کی بنیاد یورپی مادیت پر نہ ہو بلکہ اسلامی روحانیت پر ہو۔ تیسرے علامہ اقبال ایک ایسا سماجی، ثقافتی اور معاشی نظام چاہتے تھے جو دورِ جدید میں نئے علوم و افکار اور عہد حاضر کے مادی، معاشی، سائنسی اور عمرانی حاصلات کی روشنی میں اسلام کے اصولوں پر مترتب ہو اور نوعِ انسانی کے لیے رحمت و برکت کا باعث بنے۔ علامہ اقبال نے اس مسئلے پر نہایت غور کیا اور قائداعظم کے نام اپنے خط میں اس کا اظہار یوں کیا۔

"خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ اور جدید تصورات کی روشنی میں اس کو وسیع تر کرنے میں اس مسئلہ کا حل نکل آتا ہے اسلامی قانون کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر اس نظام قانون کو اچھی طرح سمجھ کر عملی جامہ پہنایا جائے تو کم از کم ہر فرد کے معاشی حقوق کا تحفظ ہو سکتا ہے" [1]

مگر اس کے لیے ایک آزاد اسلامی مملکت کا حصول نہایت ضروری ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

"لیکن اس ملک میں شریعت اسلامی کا نفاذ اور اس کی توسیع ایک آزاد مسلم مملکت یا چند مملکتوں کے بغیر ناممکن ہے۔ کئی سال سے یہ میرا ایقان رہا ہے اور اب بھی ہے کہ مسلمانوں کے معاشی مسئلہ کے حل اور پُرامن ہندوستان کے حصول کا یہی واحد طریقہ ہو سکتا ہے اگر ہندوستان میں یہ ممکن نہیں ہے تو دوسری صورت صرف خانہ جنگی کی ہے جو فی الحقیقت ہندو مسلم فساد کی صورت میں کچھ عرصہ سے جاری ہے مجھے اندیشہ ہے کہ ملک کے بعض حصوں مثلاً شمال مغربی سرحدی صوبہ میں فلسطین کے حالات کا اعادہ ہو جائے" [2]

علامہ اقبال نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ آپ کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کی صورت میں

---

۱ مکتوب ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء

۲ ایضاً

نمودار ہوتے رہے اور اگر پاکستان وجود میں نہ آتا تو برصغیر میں کبھی امن نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ علامہ اقبال کی بصیرت نے برصغیر میں مسلمانوں کے ثقافتی مسئلے کا حل کر کے پائیدار امن کی صورت قائم کی۔ علامہ اقبال نے اس سلسلے میں مراسلت کے ذریعے راہ سمجھائی۔ اس مسئلہ کو اپنی خداداد بصیرت اور حکمت عملی سے قائداعظم محمد علی جناح نے پروان چڑھایا۔ علامہ اقبال کی خدمات کا خود حضرت قائداعظم نے بھی اعتراف کیا کہ۔

"سر محمد اقبال اور ان جیسے دیگر احباب کی مخلصانہ مساعی اور وطن دوستانہ جدوجہد کے باعث ان دو اعلیٰ مقاصد کی تکمیل میں مجھے بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔" [1]

"یہ مسلم لیگ کی بڑی کامیابی تھی کہ ان کی قیادت اقلیت اور اکثریت رکھنے والے دونوں صوبوں میں یکساں طور پر تسلیم کی جانے لگی اس کامیابی کے حصول میں سر محمد اقبال نے بہت ہی نمایاں حصہ لیا تھا۔ اگرچہ عوام اس حقیقت سے ناواقف تھے۔" [2]

۱، ۲ قائداعظم کا دیباچہ، اقبال کے خطوط جناح کے نام

ممتاز فلسفی، ادیب اور صحافی

ڈاکٹر وحید عشرت پی ایچ ڈی (فلسفہ)

کی فکر انگیز کتاب

پاکستانی ثقافت کی تشکیل

جس میں

* ثقافت اور فلسفہ ثقافت
* پاکستانی ثقافت کی نظریاتی اساس
* پاکستانی ثقافت کے بنیادی مباحث پر علمی سطح پر بحث کی گئی ہے۔

ملنے کا پتہ

پاکستان فلسفہ اکادمی لاہور

۱۶۶، ستلج بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور فون ۴۳۰۴۹۵

JAMIA HAMDARD LIBRARY

MALHOTRA COLLECTION

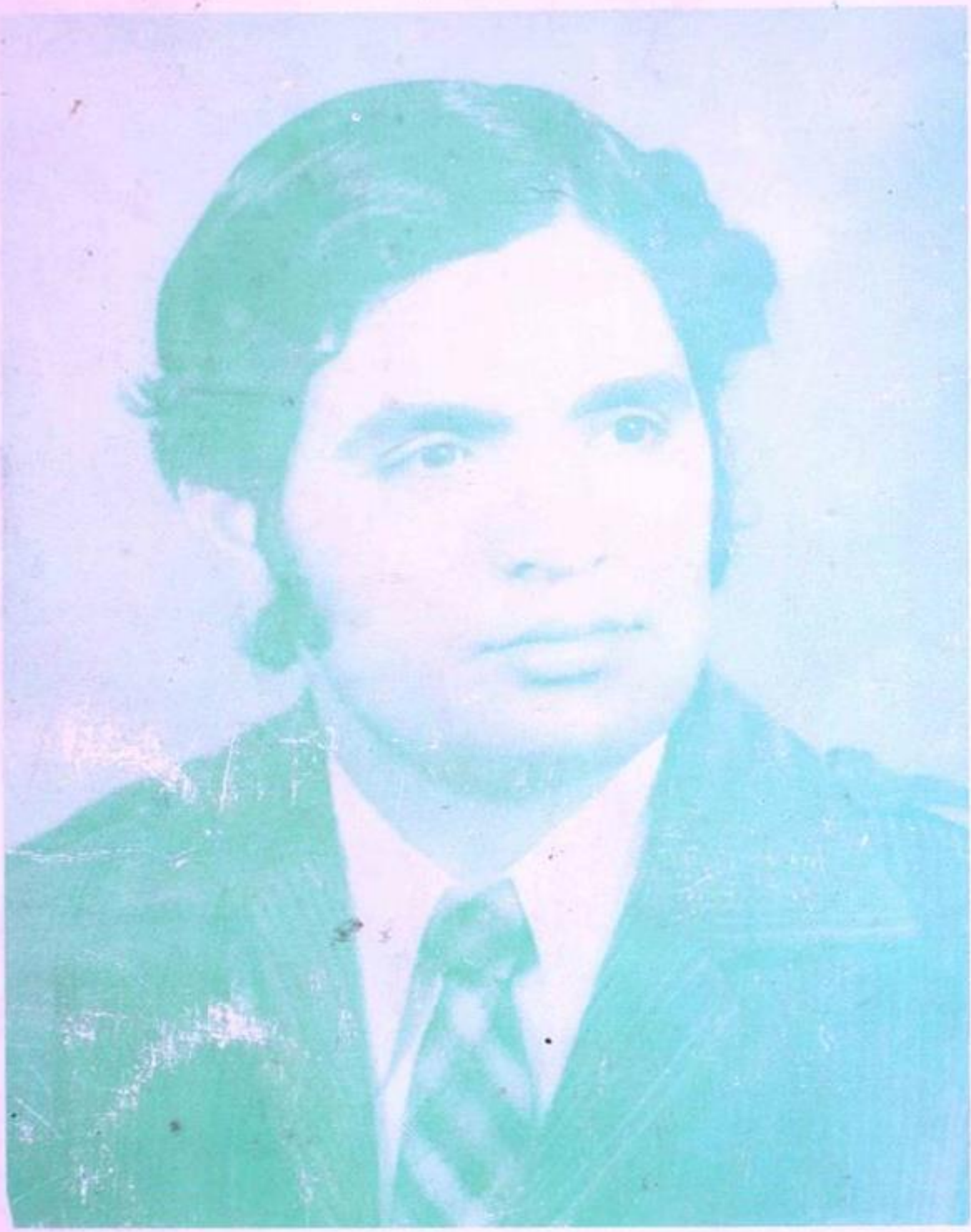

وحید عشرت